# قرآن فہمی کے بنیادی اصول



نامور مفسرین کے قلم سے!

مرتب: حافظ حسن مدنی
مدیر ماہنامہ محدث لاہور

# قرآن فہمی کے بنیادی اُصول

نامور مفسرینِ قرآن کے منتخب مضامین

# قرآن فہمی کے بنیادی اُصول

## نامور مفسرینِ قرآن کے منتخب مضامین

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ✿ علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ
مولانا محمد عبدہ الفلاحؒ ✿ مولانا عبد الرحمٰن کیلانیؒ
مولانا عبد الغفار حسن ✿ مولانا زاہد الراشدی

ترتیب و تدوین

حافظ حسن مدنی
مدیر ماہنامہ محدث لاہور

مجلس التحقیق الاسلامی
۹۹ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور

**Phones:** 5866476, 5866396, 5839404 **Fax:** 042-5836016
**URL:** www.mohaddis.com **E-Mail:** hhasan@wol.net.pk

کتاب ............ قرآن فہمی کے بنیادی اُصول
مصنّفین ............ نامور مفسرین کے منتخب مضامین
ترتیب ............ حافظ حسن مدنی
ناشر ............ مجلس التحقیق الاسلامی
سالِ طباعت ............ جنوری ۲۰۰۴ء
قیمت ............ ۶۰ روپے

ملنے کے پتے
مکتبہ قدوسیہ، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
دارالسلام، اردو بازار، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
دفتر ماہنامہ محدث، ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن لاہور
مکتبہ اسلامیہ، امین پور بازار، فیصل آباد

ڈسٹری بیوٹر
اسلامک کمیونی کیشنز: BB-16، سنٹرل پلازہ، برکت مارکیٹ، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور
☏ 5841816, 0333-4213525

# فہرست مضامین

# عرضِ مرتب

قرآن فہمی کا ذوق وشوق دورِ حاضر میں روز بروز بڑھ رہا ہے، اور اس نیک مشن کے لئے متعدد ادارے سرگرم ہیں، ۱۹۹۷ء میں کئے گئے ایک جائزے کی رو سے صرف لاہور میں اس مقصد کے لئے ۳۸/ادارے کام کررہے تھے۔ یہ تمام ادارے اپنے اپنے ذوق اور تجربے کے مطابق قرآن فہمی کی کوششیں کررہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ صرف ہرادارے نے اپنی قرآنی گرامر کی کتاب شائع کرارکھی ہے، بلکہ مخصوص قرآنی نصاب بھی شائع کرا لئے ہیں۔

زیرنظر کتاب میں ان اہم ترین مضامین ومقالات کو جمع کردیا گیا ہے جو ماہنامہ محدث میں گذشتہ سالوں میں شائع ہوتے رہے، یہ مضامین اکثر وبیشتر ان حضرات کے ہیں جن کی زندگی قرآن کو سمجھنے سمجھانے میں بسر ہوئی۔ ان مقالات میں نہ صرف زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ موجود ہے بلکہ متعدد کتب کے مضامین کا خلاصہ بھی ہے۔ یہ بحثیں عموماً کتب میں اس انداز پر یکجا نہیں ملتیں، اس لئے بھی ان کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

بعض مضامین ایسے ہیں، جو تقریر یا درسِ قرآن سے ترتیب دیے گئے ہیں، (مضامین نمبر ۱،۴،۵،۶) ان کی مناسب تفہیم کے لئے ان کی عنوان بندی کے علاوہ راقم نے ان میں عربی عبارات کا ترجمہ بھی کردیا ہے، ضروری ترمیم واضافہ اور جملوں میں کانٹ چھانٹ تو جابجا کی گئی ہے۔ جہاں ترتیب میں تبدیلی ضروری سمجھی گئی، اور حواشی کی ضرورت محسوس ہوئی، اس سے بھی گریز نہیں کیا گیا، اور آخر میں نہ صرف لاہور میں فہم قرآن کے اداروں کے پتے درج کئے گئے ہیں اور اس موضوع پر دستیاب مضامین اور کتب کی جامع فہرست بھی دی گئی ہے، تاکہ ہر لحاظ سے یہ ایک مفید کتاب بن جائے۔ میری معلومات کے مطابق اُردو زبان میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع کتاب ابھی تک موجود نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قرآن کی خدمت کے لئے قبول فرمائے اور قرآن فہمی کے طالب علموں کے لئے نفع بخش بنائے۔ آمین!

**حافظ حسن مدنی** [اپریل ۲۰۰۴ء]

# مقالہ نگاروں کا تعارف

- شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہؒ

ترجمان القرآن، اسلامی تاریخ کی عظیم عبقری شخصیت، مجددِ دین وملت

- علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ

بیسویں صدی کے سب سے عظیم محدث، روایت ساز مصنف ومحقق

- مولانا محمد عبدہ الفلاحؒ

مفسیر تفسیر 'اشرف الحواشی'، ومترجم 'مفردات القرآن' ومصنف کتبِ کثیرہ

- مولانا عبدالرحمٰن کیلانیؒ

مفسر تفسیر 'تیسیر القرآن'، مصنف 'مترادفات القرآن' وکتب کثیرہ

- مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ

سابق پروفیسر مدینہ منورہ یونیورسٹی، مصنف 'عظمتِ حدیث'، 'دین میں غلو' وغیرہ

- مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

مدیر اعلیٰ ماہنامہ 'الشریعہ' وشیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

- ڈاکٹر محمد امین

سینئر ایڈیٹر 'دائرہ معارف اسلامیہ' پنجاب یونیورسٹی، لاہور

- ڈاکٹر سہیل عبدالغفار حسن

انچارج شعبۂ حدیث، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد

- حافظ حسن مدنی

مدیر ماہنامہ 'محدث' لاہور و مدیر مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور

- شاہد حنیف شاہد

انچارج مکتبہ مجلّاتِ علمیہ، مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور

# فہم قرآن کے بنیادی اُصول

شیخ التفسیر مفتی محمد عبدہ الفلاحؒ

قرآنِ پاک نوع انسانی کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے اور آنحضرت ﷺ کی صداقت پر دائمی معجزہ، اس نے اپنے نزول کے ساتھ تاریخ عالم کا دھارا بدل دیا اور پھر اپنی جامعیت اور گہرائی کے اعتبار سے ہر دور میں انسانی عقل وفکر کے لئے رہنما بنا۔ اس کی زبان معجزانہ ہے اور اندازِ بیان اچھوتا۔ اس کی تفسیر وتاویل، اِعجاز و اِعراب، تاریخ وجغرافیہ، اُسلوبِ بیان وغیرہ پر جس قدر لکھا جاچکا ہے وہ بھی معجزہ سے کم نہیں۔

ہر دور میں مفسرین نے اپنے خصوصی ذوق اور ماحول کے مطابق اس کی خدمت کی ہے جس سے تفسیر اور علومِ قرآنی کا دائرہ وسیع تر ہوگیا ہے۔ دوسری صدی کے علماء کی تفاسیر پر نظر ڈالیں تو وہ صرف صحابہ وتابعین کے اقوال پر مشتمل نظر آئیں گی مگر اس کے بعد ہر دور میں علومِ تفسیر میں اضافہ ہی نظر آتا ہے حتیٰ کہ فی زمانہ یہ علوم اس قدر پھیل چکے ہیں کہ کسی ایک علم پر اِحاطہ بھی مشکل ہے اور علومِ تفسیر نے اس قدر ارتقائی شکل اختیار کر لی ہے کہ ان کا تاریخی جائزہ بھی بجائے خود ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ ان علوم کے ارتقا اور ان کی تفصیل سے قطع نظر یہاں پر ہم صرف ان وسائل وعناصر کو موضوعِ سخن بناتے ہیں جو قرآن فہمی میں ممد ومعاون ہوسکتے ہیں اور جن کے ملحوظ نہ رکھنے سے قرآن فہمی مشکل ہے اور پھر ان عناصر کی ترتیبی حیثیت سے صرفِ نظر کرنا بہت سی گمراہیوں اور لغزشوں کا موجب بن سکتا ہے۔

اس باب میں تتبع اور جستجو کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ علمائے تفسیر نے قرآن فہمی اور تفسیر بالماثور کے سلسلہ میں عموماً چار چیزوں سے استفادہ کیا ہے اور دورِ حاضر میں بھی ان کی

اہمیت میں اضافہ ہی ہوا ہے اور رہم عجمیت زدہ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کا مطالعہ انہی بنیادی اُصولوں کی روشنی میں کریں تا کہ قرآن فہمی کا دشوار راستہ سہل ہو جائے۔ اب ہم ان اُصول وعناصر میں سے ہر ایک کی تفصیل پیش کرتے ہیں:

قرآن کی تلاوت اور اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن نے بعض حقائق کو ذہن نشین کرنے کے لئے متعدد مقامات پر اُن کا اِعادہ کیا ہے لیکن ہر مقام پر اندازِ بیان جداگانہ ہے۔ ایک مقام پر اگر اجمال ہے تو دوسرے مقام پر اسی کو تفصیل سے بیان فرما دیا ہے اور پھر مقصد و اِستدلال کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بعض آیات میں اگر اِطلاق ہے تو دوسری آیات میں اسے تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر اگر عموم ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے۔ پھر اسی قسم کے اندازِ بیان کے پیش نظر قرآن نے اپنے آپ کو ﴿كِتَابًا مُّتَشَابِهًا﴾ اور مَثَانِيَ فرمایا ہے اور اسی تکرار کو تصریف ِ آیات سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے اسی پیرایۂ بیان کے پیش نظر علما نے لکھا ہے کہ

## ❶ قرآن کی تفسیر، قرآن کے ذریعے

القرآن يفسِّر بعضُه بعضًا "قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی وضاحت کرتا ہے۔" لہٰذا قرآن فہمی کیلئے یہ لازم ہے کہ اولاً خود قرآن سے ہی رہنمائی حاصل کی جائے۔ علما تفسیر نے اس کو اولیٰ اور بنیادی حیثیت دی ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کا سب سے بہتر طریق کیا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اوّلاً قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔" (مقدمہ تفسیر، ص ۳)

علامہ ابن تیمیہؒ نے متعدد مقامات پر اسی اصل پر زور دیا ہے۔ چنانچہ آپؒ فتاویٰ میں رقمطراز ہیں: (۱۳/۳۶۳)

"اصح طریق یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے تلاش کی جائے کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر اگر اِجمال ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل مذکور ہے، اسی طرح ایک مقام پر اختصار ہے تو دوسرے مقام پر اسی مفہوم کو قدرے اِطناب (طوالت) سے ذکر فرمایا گیا ہے۔"

(i) مثلاً سورۂ مؤمن آیت ۲۸ میں ہے

﴿وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ﴾

کہ ''اگر یہ سچا ہے تو تمہیں وہ کچھ پہنچ کر رہے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے۔''

یہاں پر بَعْضُ الَّذِيْ سے مراد دنیا میں عذاب کا آنا ہے کیونکہ اسی سورہ کے آخر میں ہے:

﴿فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ﴾ (آیت ۷۷)

''اگر ہم تمہیں وہ بعض جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، دنیا میں دکھلا دیں یا اس سے پہلے تمہیں فوت کرلیں تو ان لوگوں نے بہرحال ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔''

(ii) سورۃ نساء (آیت ۲۷) میں ہے:

﴿ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴾

''جو لوگ اپنی شہوات کے تابع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم بری طرح گمراہ ہو جاؤ۔''

'جو لوگ' سے اہل کتاب مراد ہیں کیونکہ اسی سورہ میں ہے

﴿اَلَمْ تَرَاِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلَالَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوْا السَّبِيْلَ﴾ (آیت:۴۴)

''تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کتاب سے بہرہ ور کیے گئے کہ وہ گمراہی اختیار کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔''

(iii) سورۂ بقرہ (آیت:۳۷) میں ہے ﴿فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَبِّهٖ كَلِمَاتٍ﴾

''پس آدمؑ نے اپنے پروردگار سے چند کلمات لے لئے۔''

سورۂ اعراف (آیت:۲۳) میں ان کلمات کی تفصیل مذکور ہے یعنی

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمارا گناہ معاف نہ کیا اور ہم پر رحم کی نظر نہ کی تو ہم خائب وخاسر ہو جائیں گے۔''

(iv) اسی طرح آیت ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾(الانعام :۱۰۳) کی وضاحت سورۂ قیامہ کی آیت:۲۳ ﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾سے اخذ کر سکتے ہیں۔

(v) سورۃ المائدہ میں آیت ﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّامَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ تفسیر آیت نمبر۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾سے کر دی گئی ہے۔

(vi) مطلق ومقید کی مثال میں آیتِ وضو اور آیت تیمّم پیش کر سکتے ہیں کہ آیتِ تیمّم میں ﴿وَاَيْدِيكُمْ مِّنْهُ﴾ مطلق ہے اور آیتِ وضو میں ﴿اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے ساتھ مقید ہے جیسا کہ اکثر شوافع کا مسلک ہے۔

(vii) اسی طرح بعض علما کے نزدیک آیتِ ظہار میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ﴾ آیتِ قتل میں ﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ کے ساتھ مقید ہے۔

(viii) سورۂ بقرہ (آیت: ۲۵۴) میں قیامت کے دن خِلَّت یعنی دوستی کی نفی مذکور ہے۔ مگر زخرف (آیت: ۶۷) ﴿اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلاَّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ کہ مؤمنین کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔

☜ 'تفسیر القرآن بالقرآن' کے سلسلہ میں اختلافِ قراءات کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین بعض آیات کی تفسیر میں اختلافِ قراءت سے استفادہ کرتے رہے ہیں مثلاً سورۃ الاسراء (آیت :۹۳) ﴿اَوْيَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں مِنْ ذَهَبٍ ہے جس سے لفظ زُخرف کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ اسی طرح آیت ﴿فَاسْعَوْا اِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ میں ایک قراءت ﴿فَامْضَوْا اِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ ہے جس سے سَعْی کے معنیٰ کی وضاحت ہوتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس بہت سی قراءات ہیں جن سے نفس آیت کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قراءت تو تفسیر کے سلسلہ میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی ہے۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

''اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوالات حضرت ابن عباسؓ سے استفسار کئے بغیر ہی حل ہوجاتے۔'' (المذاہب الاسلامیہ فی التفسیر)

بلکہ بعض علما نے تفسیری ارتقا کے سلسلہ میں اختلافِ قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہ وتابعین نے اختیار کیا۔ مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قرأتِ متواترہ تو نصوصِ قرآن کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن قراءاتِ شاذہ کو ہم تفسیری مراجع میں شمار کرسکتے ہیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن کے طرز پر علما نے تفاسیر بھی لکھی ہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر کو بطورِ مثال پیش کر سکتے ہیں جو کہ 'تفسیر القرآن بالقرآن' کے سلسلہ میں نہایت معتمد تفسیر ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ، ابن تیمیہؒ کے تلمیذِ رشید تھے اور حافظ ابن تیمیہؒ اس طرزِ تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور پھر حافظ ابن کثیرؒ خود بھی سلفی نقاد تھے اور سلف کے طرزِ تفسیر کو ترجیح دیتے تھے۔ اس بنا پر ان کی تفسیر ایک تو سلف کے مسلک کی ترجمان نظر آتی ہے اور دوسرے، اس میں اسرائیلیات پر تنقید بھی ہے جس سے علامہ طبریؒ کی تفسیر معریٰ (عاری) نظر آتی ہے۔ ہندوستانی علمائے تفسیر میں شیخ الاسلام امرتسری وہ واحد عالم ہیں جنہوں نے تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن خالصتاً اسی طرز پر لکھی ہے۔ یہ تفسیر گو مختصر ہے لیکن موصوف کی یہ کوشش [اس حوالے سے] قابل قدر ہے۔

## ❷ قرآن کی تفسیر، حدیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

قرآن فہمی کے سلسلہ میں سنتِ نبویؐ کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے بلکہ ائمہ نے سنتِ نبوی ﷺ کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ آیت ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ (النحل: ۴۴) میں قرآن کی تبیین کو اہم ترین فریضہ رسالت بتلایا گیا ہے۔ اس بنا پر علمائے اسلام نے سنتِ نبویؐ کی تدوین میں بھی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کی حجیت سے انکار دراصل تفسیر بالرائے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کیلئے اس کو لازم قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ الرسالة (رقم ۳۰۳) میں لکھتے ہیں:

"آنحضرتؐ نے جو بھی فیصلہ صادر فرمایا ہے، وہ قرآن سے سمجھ کر ہی صادر فرمایا ہے۔"

اس بنا پر علماء نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ قرآن فہمی پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے، اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا: ألا إني أوتيت القرآن ومثله معهٗ يعني السنة"

(فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ج ۱۳/ص ۳۶۳، ۳۶۴)

اور سنت بھی وحی ہے جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ ائمہ نے اس پر دلائل پیش کیئے ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں سنت کو مرجع ثانی کی حیثیت دی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے۔'' (مقدمہ تفسیر، ص۳)

خصوصاً قرآن میں جس قدر آیات احکام ہیں، ان کی تفسیر و توضیح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے...... ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جہاں تک قرآن میں اَحکام کا تعلق ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جاسکتے ہیں لہٰذا تفسیر قرآن کے اس حصہ کے لئے سنت کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔'' (ص۳۳)

## دو اعتراض اور ان کے جوابات

یہاں پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں ضعیف روایات کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں :"ثلاثة ليس لها أصل: التفسير والملاحم والمغازي" کہ ''تین قسم کی کتابیں بے اصل روایات پر مشتمل ہیں۔ یعنی تفسیر ملاحم اور مغازی۔'' تو پھر تفسیر بالحدیث پر کیسے اعتماد ہوسکتا ہے جبکہ ان سے اِستناد ہی جائز نہیں ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ساری روایات مراد نہیں ہیں بلکہ احمد بن حنبلؒ کے پیش نظر خاص قسم کی کتابیں ہیں جن کی وہ تردید کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں:"وأما كتب التفسير فمن أشهرها كتابا الكلبي ومقاتل بن سليمان وقد قال أحمدؒ فى تفسير الكلبى من أوله الى آخره كذب"

پھر اگر ہر قسم کی تفسیری روایات امام احمدؒ کے نزدیک غیر مستند ہوتیں تو امام موصوف اس تفسیری صحیفہ کی تحسین نہ فرماتے جو کہ علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں بلکہ امام نے اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے (الفوز الکبیر) چنانچہ امام بخاریؒ اپنی تفسیر میں اسی صحیفہ پر اعتماد کرتے نظر آتے ہیں۔

☜ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ تفسیر مرفوع بلاشبہ حجت ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "لم يكن النبى يفسّر شيئا من القرآن إلا آيات تُعَدُّ

علّمهن النبی إیاہ جبریل یعنی ''نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی صرف گنتی کی چند آیات کی تفسیر کی ہے، جن کی تفسیر جبرئیلؑ نے آپ کو سکھلائی تھی۔''

اسی طرح امام سیوطیؒ اس موضوع پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"الذي صح من ذلك قليل جدا بل أصل المرفوع منه فی غاية القلة"

''حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے۔'' اس لئے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث پیش کرنا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ مرفوع حدیث کی قلت کا دعویٰ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے، اسی طرح قرآن کے معانی و مطالب بھی بیان کئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ سورۂ نحل آیت ۴۴ میں قرآن کی تبیین کو آنحضرتؐ کے فرائض میں رکھا گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتّبع دوسرے علماء نے دلائل سے اس کو ثابت کیا ہے جن میں سے ہم بعض کی طرف بالاختصار اشارہ کرتے ہیں:

① ابوعبدالرحمٰن اسلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی، ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور دیگر صحابہؓ کا بیان ہے کہ جب ہم آنحضرتؐ سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک اس کے معنی و مفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملاً اپنا نہ لیتے، ان سے آگے نہ بڑھتے۔ چنانچہ صحابہؓ کا بیان ہے: "فتعلَّمنا القرآنَ والعلم والعمل جميعا" ''ہم نے قرآن کا علم اور اس پر عمل کرنا بیک وقت سیکھا''...... یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے۔ موطأ امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ''انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کردیئے'' اور حضرت عمرؓ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی اور ظاہر ہے کہ یہ محض قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

حافظ ابن تیمیہؒ فتاویٰ میں مزید وضاحت کے طور پر لکھتے ہیں:

''اور اس بات کو ہم عادتاً باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کوئی شخص مثلاً طب یا حساب کی

کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر سمجھے پڑھنا (آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہوسکتا ہے) مگر صحابہ کرامؓ سے اس کا تصور بھی بعید ہے خصوصاً جبکہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق حاصل کرنے پر بھی حریص رہتے تھے۔'' (فتاویٰ: ج۱۳رص ۳۳۱ تا ۳۳۳)

## بحث روایتِ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ

پھر جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں، ان کا حضرت عائشہؓ کی روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اولاً تو حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہیں جس پر امام بخاریؒ اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے۔ خود امام طبریؒ ان کے متعلق لکھتے ہیں: ''إنه ممّن لا یعرف في اَهل الآثار'' یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کو اہل روایت میں سے کوئی نہیں جانتا۔

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرطِ صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ یعنی حضرت عائشہؓ کے اس بیان کا تعلق قرآن کی تفسیر کے اس حصہ سے ہے جو غیبی اُمور سے متعلق ہے۔ مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیتِ الٰہی کے خلاف تھا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے جبریلؑ کے جواب میں «ما المسئول عنها بأعلم من السائل» (جس سے پوچھا جارہا ہے، وہ بھی پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا) کے جملہ سے اس کی وضاحت فرمادی ہے۔

نیز امام طبریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ

''تفسیر چار قسم پر ہے: ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے تھے۔ اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی...... اور چوتھی قسم وہ جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا ادراک نہیں کرسکتا۔ اس قسم کی تفسیر سے آنحضرتؐ تعرض نہ فرماتے تھے۔''

الغرض آنحضرت ﷺ نے قرآن کی تفسیر وتشریح فرمائی ہے جو کہ کتبِ احادیث وسنن میں محفوظ ہے۔ اسی بنا پر علماء نے قرآن وسنت کو لازم وملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو قرآن کا شارح تسلیم کیا ہے۔ امام اوزاعیؒ حسان بن عطیہ سے بیان کرتے ہیں:

”آنحضرت ﷺ پر قرآن کی وحی نازل ہوتی تو پھر حضرت جبریلؑ قرآن کی تفسیر کے لئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔“

یہی امام اوزاعیؒ مکحول سے روایت کرتے ہیں کہ ”القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى القرآن“ کہ قرآن اپنی تشریحات میں جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔

## ❸ اقوالِ صحابہؓ

اگر قرآنِ کریم کی کوئی مشکل خود قرآن اور حدیث سے حل نہ ہو رہی ہو تو اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع لازم ہے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ جاہلی اَدب، اہل کتاب کے عادات و اَطوار اور لغت کے اَوضاع و اَسرار سے بخوبی واقف تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن اَحوال و ظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اُن کی نظروں کے سامنے تھے اور وہ آیات کے پس منظر سے آگاہ تھے پھر ان کے اَذہان بھی صاف ستھرے اور گردوپیش کی آلائشوں سے منزہ تھے۔ ان جملہ وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: (مقدمہ تفسیر)

”صحابہ کرامؓ اس وقت کے قرائن واحوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم، علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔“

اس بنا پر علما نے قرآن وسنت کے بعد اقوالِ صحابہؓ کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے خصوصاً ان صحابہؓ میں سے خلفاءِ اربعہ اور اصحابِ علم وفضل کے اقوال سے بے اعتنائی ناممکن سی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ بھی اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وحنيئذ إذا لم نجد التفسير في القرآن ولا في السنة رجعنا فى ذلك إلى أقوال الصحابة فإنهم أدرى بذلك لما شاهدوه من القرآن والأحوال التى اختصوا بها ومالهم من الفهم التامّ والعلم الصحيح والعمل الصالح......الخ“

”جب ہمیں کسی آیت کی قرآن اور سنت میں تشریح نہ ملے تو ہم صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ وہ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے بایں وجہ کہ وہ نزولِ وحی کے وقت موجود

تھے، اور ان حالات سے جن میں قرآن نازل ہوا، اُنہیں آ گاہی تھی، علاوہ ازیں وہ مکمل فہم وفراست، صحیح علم اور نیک اعمال کی خوبیوں سے متصف تھے۔“

۞ ۞ ۞ ۞

تتبع سے ثابت ہوتا ہے کہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ نے مصادرِ خمسہ سے استفادہ کیا ہے یعنی قرآن وسنتِ نبوی جن کا بیان گزر چکا ہے......

علاوہ ازیں تین ماخذ حسبِ ذیل ہیں جن کی حیثیت پر ہم بحث کرتے ہیں :

فی اسبابِ نزول کی معرفت

فی تورات وانجیل (اسرائیلیات)

فی اَوضاعِ لغت اورادبِ جاہلی

## اَسبابِ نزول

بلاشبہ قرآن پاک تدریجاً بحسبِ الحوائج نازل ہوا ہے۔قرآن کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداء موعظت وعبرت یا اصولِ دین اوراحکامِ تشریع کے بیان میں نازل ہوا ہے لیکن قرآن کا کچھ حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اُترا ہے۔علماء نے ان حوادث رسوالات کو اَسباب سے تعبیر کیا ہے۔ (قرطبی،ص ۳۹)

اسبابِ نزول کے علم سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے اور آیت کے سبب سے جہالت بسااوقات حیرت کا موجب بنتی ہے، اس لئے اسبابِ نزول کی معرفت کو علم تفسیر میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور علماء نے علومِ قرآن پر جو کتابیں لکھی ہیں اُن میں اسبابِ نزول کے عنوان کو مستقل طور پر ذکر کیا ہے بلکہ خالصتاً اسبابِ نزول پر بھی کتابیں مرتب کی ہیں، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں:

”أفرده بالتصنيف جماعة أقدمهم علي ابن المديني شيخ البخاري“

” علما نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی

تصنیف علی بن مدینیؒ کی ہے جو امام بخاری کے شیوخ سے ہیں۔''

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے اس سلسلہ کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد ۴۲۷ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی فیه أعواز (اس میں مشکلات ہیں) کہہ کر اس پر تنقید بھی کردی ہے اور حافظ ابن حجرؒ (۸۵۲ھ) کی اسبابِ نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''فات عنه مسودة فلم نقف عليه كاملا''

''ان کی کتاب کا مسودہ ضائع ہوگیا جس کی وجہ سے ہم پوری طرح اس سے فیض یاب نہیں ہوسکے۔''

پھر امام سیوطیؒ نے خود بھی اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کے متعلق لکھتے ہیں:

وألفت فيه تأليفا موجزا لم يؤلف مثله فى هذا النوع سمّيته لباب النقول فى أسباب النزول''

''اس موضوع پر میری بھی ایک یگانہ روزگار تالیف ہے جس کا نام میں نے لباب النقول في أسباب النزول رکھا ہے۔''

بہرحال اسبابِ نزول کی اہمیت کے پیش نظر علما نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اسباب کے بیان کا اہتمام کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ الفوز الکبیر میں اس کی معرفت کو المواضع الصّعبة (مشکل مقامات) میں سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح (واضح / جدا جدا) کرنے کی سعیِ مشکور فرمائی ہے لہٰذا جن علماء نے اس کی افادیت اور تاریخی حیثیت کو ''لاطائل'' (بے فائدہ) کہا ہے، ان کا موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور دیگر بعض علماء نے اس میں غلو کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اسبابِ نزول کی معرفت کے بغیر قرآن کی تفسیر نہیں ہوسکتی اور علامہ سیوطیؒ اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر قرآن پر اِقدام کو حرام قرار دیتے ہیں تاہم یہ دونوں گروہ اِفراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔ اصل اور صحیح موقف ان کے بین بین ہے جیسا کہ ابن دقیق العیدؒ اور ابوالفتح قشیریؒ نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس فن کی معرفت فی الجملہ معاوِن ہوسکتی ہے ورنہ تفسیر قرآن صرف اس پر موقوف نہیں ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے مقدمة التفسير میں لکھتے ہیں:

معرفة سبب النزول تعين على فهم الآية فان العلم بالسبب يورث العلم بالمسبّب
''سببِ نزول کی معرفت آیت کے سمجھنے میں معاون ہے کیونکہ سبب کی معرفت کے ذریعے مسبّب تک رسائی ہوجاتی ہے۔''

## حقیقتِ حال

صحابہ یا تابعین نے جو اَسبابِ نزول بیان فرمائے ہیں، وہ دو قسم پر ہیں: اول وہ جن کی طرف خود آیات میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً مغازی یا دیگر واقعات کہ جب تک ان واقعات کی تفصیل سامنے نہ ہو متعلقہ آیت میں مذکورہ جزئیات ذہن نشین نہیں ہوسکتیں۔ اس قسم کے اسبابِ نزول کے متعلق تو واقعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کے لئے اِن پر عبور لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے تاریخ جاہلیت اور مغازی کی معرفت کو قرآن فہمی کے لئے لازمی قرار دیا ہے کیونکہ متعلقہ آیات میں ان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں۔

لیکن دوسری قسم کے اسبابِ نزول وہ ہیں جنہیں صحابہ یا تابعین کسی آیت کے تحت نزلَتْ فی کذا یا أنزل الله في کذاکے الفاظ سے ذکر کردیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کو ایک طرف کی مناسبت سے تو آیت کے تحت ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ آیت کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے ان کی معرفت لازمی نہیں ہے (فتاویٰ: ج۳ /ص ۳۳۸،۳۴۰) شاہ ولی اللہؒ الفوز الکبیرمیں لکھتے ہیں:

"وقد ذكر المُفسّرون تلك الحادثة بقصد الإحاطة بالآثار المناسبة للآية أو بقصد بيان ماصدق عليه العموم وليس هذا القسم من الضروريات...... وكان غرضهم تصوير ما صدقت عليه الآية"

''بسا اوقات مفسرین آیت کے تحت کوئی واقعہ اس مقصد سے ذکر کردیتے ہیں کہ اس آیت سے مناسبت رکھنے والے واقعات جمع ہوجائیں یا جس امر کی عموم تصدیق کر رہا ہو اس کی وضاحت ان کا مقصود ہوتی ہے۔ یہ قسم ضروری اسبابِ نزول سے نہیں ہے۔ اس سے ان کا مقصد اس امر کی تصویر کشی کرنا ہوتا ہے جس پر آیت صادق آسکتی ہے۔''

پہلی قسم کے اسباب کے بیان میں چونکہ صحابہؓ کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سراسر روایت وسماع پر مبنی ہوتا ہے۔ اس بنا پر علما نے بلا اختلاف اس کو حدیثِ مسند کا درجہ دیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں

”وإذا ذکر سببا نزلت عقبه فإنهم کلهم یدخلون مثل هذا فی المسند، لأن مثل ذلك لايقال بالرأي“

”صحابی جب کسی آیت کے سبب نزول میں ”اس کے معاً بعد یہ آیت نازل ہوئی۔“ جیسے الفاظ استعمال کرے تو اس طرح کی روایات حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہیں کیونکہ اس طرح کی بات محض رائے سے نہیں کہی جاسکتی۔“

اور دوسری قسم (یعنی جب کوئی صحابی نَزَلت في کذا کے الفاظ استعمال کرے) میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابیؓ کے اجتہاد ورائے پر ہے۔ امام حاکمؒ معرفة علوم الحدیث میں لکھتے ہیں :

وإذا أخبر الصحابي الذي شهد الوحي والتنزیل عن آیة من القرآن أنها نزلت فی کذا، فإنه حدیث مسند و مشی علی هذا ابن الصلاح وغیره

”جب کوئی صحابی جو نزولِ وحی/آیت کے وقت موجود تھا، قرآن کی کسی آیت کے بارے میں خبر دے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی تو یہ بھی حدیثِ مرفوع ہے، یہی رائے ابن صلاحؒ وغیرہ کی بھی ہے۔“

مگر حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل وتوزیع کے قائل نظر آتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ان الفاظ سے سبب نزول مراد ہے تو یہ تمام کے نزدیک حدیثِ مسند میں داخل ہے اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے (مگر اس کا سببِ نزول نہیں ہے) تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہوگا یا نہیں۔ امام بخاریؒ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں لیکن دوسرے علماء اس کا انکار کرتے ہیں اور اکثر مسانید اسی اصطلاح کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔ جیسے مسند امام احمد بن حنبل وغیرہ اور اکثر علماء کا میلان بھی امام احمد بن حنبل کی طرف ہے، چنانچہ زرکشیؒ لکھتے ہیں:

”قد عرف من عادة الصحابة والتابعین أن أحدهم إذا قال نزلت هذه الآیة فی کذا فإنه یرید بذلك أنها تتضمن هذا الحکم لا أن هذا کان السبب فی نزولها فهو من جنس الاستدلال علی الحکم بالآیة لا من جنس النقل لما وقع “

”صحابہؓ وتابعینؒ کی یہ معروف عادت ہے کہ جب وہ ”یہ آیت فلاں مسئلے میں نازل ہوئی“

کہیں تو اس سے ان کی یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ آیت اس حکم کو شامل ہے نہ کہ فلاں واقعہ اس آیت کا سببِ نزول ہے۔ پس صحابہؓ کا یہ کہنا آیت سے کسی حکم کے بارے میں استدلال کرنے کی قبیل سے ہوتا ہے نہ کہ واقعہ کی خبر نقل کرنے کی جنس سے۔'' (ج ۱/ ص ۳۱، ۳۲)

الغرض اسبابِ نزول کے بیان میں صحابہ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو صحابی کو خود بھی اپنے بیان پر اعتماد نہ ہوتا اور وہ أحسب هذه الآية نزلت في كذا (میرا گمان ہے کہ یہ آیت فلاں واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی) کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا لہٰذا اسبابِ نزول کے بیان میں احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم صحابہ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ علامہ واحدیؒ لکھتے ہیں:

''لايحل القول فى أسباب نزول الكتاب إلابالرواية والسماع ممن شاهدوا التنزيل ووقفوا على الأسباب و بحثوا عن علمها''

''کتاب اللہ کے اسبابِ نزول کے بارے میں کچھ کہنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہی صحابہ کی روایت اور سماع معتبر ہے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود تھے اور وہ اس کے اسباب سے واقف تھے اور اسی کے جاننے کے لئے بحث و کرید میں لگے رہتے تھے۔''

اس بنا پر سلف رحمہم اللہ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک کسی صحابی سے صحتِ سند کے ساتھ اس کا مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے۔ ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہؓ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

''اتق الله وقل سدادا ذهب الذين يعلمون فيما أنزل القرآن'' اللہ سے ڈرو اور کھری بات کہو، وہ لوگ چلے گئے جو جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا؟''

لیکن ان کے بعد علماء نے اس سلسلہ میں تساہل سے کام لینا شروع کر دیا حتیٰ کہ کذب بیانی کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ علامہ واحدی اسی قسم کے علما پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وأما اليوم فكل أحد يخترع شيئا و يختلق إفكا وكذبا ملقيا زمامه الى الجهالة غير مفكر فى الوعيد للجاهل بسبب الآية''

''اور آج تو یہ حالت ہے کہ ہر ایک کوئی چیز گھڑ لیتا، جھوٹ بنا لیتا ہے۔ اپنی لگام جہالت کے سپرد کرتے ہوئے، وہ ذرا نہیں سوچتا کہ آیت کے سببِ نزول سے ناواقف کیلئے کیا وعید ہے؟''

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شانِ نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور اپنی تفاسیر میں رطب ویابس کو جمع کر دیا بلکہ مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا۔ حتیٰ کہ امام طبریؒ جیسے مؤرخ اور مفسر بھی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اس نوع کی تفسیری روایات پر نقد ونظر کی ضرورت ہے اور جب تک کسی حادثہ کا صحتِ اسناد سے سببِ نزول ہونا ثابت نہ ہو جائے محض تفسیری روایت کی بنا پر اسے قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

## اسبابِ نزول کی حیثیت

یہاں پر یہ بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ کوئی آیت اپنے نفس الامری مفہوم اور عموم کے اعتبار سے سببِ نزول کے ساتھ مقید ومختص نہیں ہوتی بلکہ معنی ومفہوم کے اعتبار سے اس آیت کو عموم پر ہی محمول کرنا ضروری ہے۔ علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

> ''اَصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو اس کے عموم پر محمول کیا جائے اور اسبابِ خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے...... کیونکہ صحابہ کرامؓ پیش آمدہ واقعات کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہیں گو ان کے اسبابِ نزول خاص تھے۔''

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں (ج ۱۵ ص ۳۶۴ و ایضاً ص ۴۵۱) لکھتے ہیں:

"قَصْر عمومات القرآن على أسباب نزولها باطلٌ فإن عامة الآيات نزلت بأسباب اقتضت ذلك وقد علم أن شيئا منها لم يقصر على سببه"

> ''عمومِ قرآن کو اسبابِ نزول پر محدود کر دینا باطل ہے کیونکہ اکثر آیات ایسے اسباب کے تحت نازل ہوئی ہیں جو اس کے مقتضی تھے۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ کوئی آیت بھی اپنے سبب نزول تک محدود نہیں ہے'' (بلکہ عموم لفظ کے اعتبار سے اس میں وسعت ہے)

اور پھر آگے چل کر (ص ۴۵۱ پر) لکھتے ہیں:

"ورود اللفظ العام على سبب مقارن له في الخطاب لا يوجب قصره عليه ...... غاية مايقال: إنها تختص بنوع ذلك الشخص فتعم ما يشبههٗ...... الخ"

> ''کسی عام لفظ کا خطاب کے مخصوص سبب کی بنا پر آنا اس کو اس سبب سے مقید نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں آئے ہیں اور اس سے

ملتے جلتے لوگوں کو یہ الفاظ شامل ہوں گے۔''

## خلاصۂ کلام

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسبابِ نزول دو قسم پر ہیں بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور پر آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہو پاتا۔ لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو علمائے تفسیر نے اسباب کے طور پر ذکر کردیئے ہیں ورنہ درحقیقت نہ تو وہ اسبابِ نزول ہی ہیں اور نہ ہی ان سے صرفِ نظر کرلینے سے آیت کا مفہوم سمجھنے میں کسی قسم کی مشکل پیش آتی ہے۔ جیسا کہ شاہ صاحب نے 'الفوز الکبیر' میں تصریح کی ہے۔ نیز یہ کہ کوئی بھی آیت اپنے سببِ نزول کے ساتھ مختص نہیں ہوتی بلکہ اسے عموم پر رکھنا ضروری ہے۔

## اِسرائیلیات کی حیثیت

بلاشبہ قرآن پاک کو دوسری کتبِ سماویہ پر مُهَيْمِن (نگہبان) کی حیثیت حاصل ہے اور اس نے بعض واقعات اور مسائل کے بیان کرنے میں تورات سے موافقت بھی کی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی وِلادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے، تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج واُسلوب کی اِتباع سے گریز کیا ہے اور ان واقعات کی غیر ضروری جزئیات کو ترک کرکے صرف انہی حصص کے بیان پر اکتفا کیا ہے جن کا تعلق عبرت وموعظت سے ہے یا ان واقعات کو اہل کتاب کے سامنے بطورِ استشہاد پیش کرنا مقصود ہے۔ اس بنا پر بعض مفسرین صحابہؓ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں اہل کتاب کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایات بھی قبول کیں تاہم صحابہ کرام نے نقل و روایت میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث ''حدّثوا عن بني إسرائیل ولا حرج'' (بنی اسرائیل سے روایت کرلو، اس میں کوئی حرج نہیں!) کے پیش نظر جواز کی حد تک اِن سے اِستفادہ کیا ہے اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن و حدیث اور اِسلامی عقائد سے متصادم نہ تھیں۔ (مقدمہ اصول تفسیر از ابن تیمیہؒ، ص۲۶)

اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسرائیلیات کی روایت تو جائز ہے لیکن بلا دلیل اس کی تصدیق یا تکذیب جائز نہیں ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:

«إذا حدّثكم أهلُ الكتاب فلاتصدّقوهم ولاتكذّبوهم فأما إن يُحدّثوكم بحق فتكذبوه وأما إن يحدثوكم بباطل فتصدّقوه»

''جب تمہیں اہل کتاب کوئی واقعہ ذکر کریں تو اس کی تصدیق کرو نہ اس کو جھٹلاؤ، مبادا وہ تمہیں سچی خبر دے رہے ہوں تو تم اُن کو جھٹلا دو اور ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں غلط خبر دے رہے ہوں اور تم ان کی تصدیق کر بیٹھو۔''

جن صحابہؓ نے اہل کتاب سے روایت لی ہے ان میں سے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان صحابہؓ کی مرویات ملاحظہ کرنے سے ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔ تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کی روایات بطورِ استشہاد نقل ہوئی ہیں نہ کہ کلیتاً انہی پر اعتماد کیا گیا ہے۔

## اسرائیلیات اور تابعین

البتہ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ نے اہل کتاب سے اَخذِ روایت میں توسع سے کام لیا اور ہم سمجھتے ہیں کہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس دور میں بہت سے اہل کتاب مسلمان ہوگئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لئے اُن کے گرد جمع ہوجاتے تھے، اِس دور میں مفسرین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب ویابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنا لیا، ان میں سے مقاتل بن سلیمان (۱۵۰ھ) اور وہب بن منبّہ (۱۱۴ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تابعین کے بعد تو اس مشغلہ نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کی خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ دورِ تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔ اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل و روایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی بعض تحریروں میں اس کی تصریح کی ہے اور شاہ ولی اللہ بھی الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں:

"إن النقل عن بني إسرائيل دسيسة دخلت فی ديننا......"

''بنی اسرائیل سے روایت کرنا ایک پوشیدہ مکر ہے جو ہمارے دین میں داخل ہوگیا ہے۔''

لہٰذا قرآن کے ایک طالب علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ذکر میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غوروفکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل و روایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں مدد اور معاون ہوں اور پھر سنت سے ثابت بھی ہوں (روح المعانی: ج۱۵/ص۹۳) اور اس سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کا توجہ سے مطالعہ بہت مفید ہوسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی تفسیر میں متعدد مقامات پر اسرائیلیات پر تنقید کی ہے۔ البتہ اختلاف کی صورت میں ایک مؤلف ان سب کو نقل کرکے ان میں سے صحیح بات کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ پھر بہتر یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اسرائیلیات کو کلیتاً ترک کرکے قرآن پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا جائے جیسا کہ قرآن نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے (الفوز الکبیر: ص۴۵،۴۶) خصوصاً قصص کے باب میں اِجمال و تفصیل کے موقع پر خود قرآن سے تفصیلات کو اَخذ کرنے کو ایک رہنما اصول قرار دیا ہے۔

## خلاصۂ بحث

صحابہ کرامؓ نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان سے روایت کو جائز سمجھا ہے تاہم اس میں حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور اسرائیلیات کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلہ میں قبول تو کرسکتے ہیں مگر ان کو میزانِ صحت قرار نہیں دے سکتے۔

## قج لا صلے لغت ومحاورات

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ سے بھی روشنی نہ پڑتی ہو اور تابعین بھی اس کی تاویل میں مختلف ہوں تو پھر لغت عرب اور محاورات کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں خود صحابہ کرامؓ اس اصل سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابن

عباسؓ فرماتے ہیں:

"الشعر دیوان العرب فاذا انعاجم علینا شیئ من القرآن رجعنا الیه"

''شعر اہلِ عرب کا دیوان ہے، جب ہمیں کوئی لفظ اجنبی معلوم ہوتا تو ہم اس کی طرف رجوع کرتے۔'' (مقدمہ اصولِ تفسیر لابن تیمیہؒ)

لیکن اس عنصر سے استفادہ ہر ایک کے بس کے بات نہیں صرف وہی شخص اس عنصر کو بروئے کار لاسکتا ہے جو عربی زبان میں خصوصی ذوق رکھتا ہو۔ دواوین عرب اُسے مستحضر ہوں اور عربی زبان کے اَسالیب سے بدرجہ اَتم واقفیت رکھتا ہو۔ محض لغات بینی سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ معاجم وقوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اور بلا اسناد مختلف اقوال کو جمع کر دیا ہے، خصوصاً اَشعار و اَمثال جن کو حضرت ابن عباسؓ دیوانُ العرب قرار دے رہے ہیں۔ علماءِ ادب جانتے ہیں کہ اشعار کی نسبت میں اِختلاط و اِختلاف کو بے حد دخل ہے اور شاذ ونادر ہی کوئی ایسی روایت ہوتی ہے جس پر اعتماد ہو سکے۔ پھر محاوراتِ عرب کے بیان میں بھی باہم اختلاف ہے اور علمائے لغت نے تشریحات میں عمومی لغت ومحاورہ کو سامنے رکھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ الفاظِ قرآن کی تشریح وتوضیح ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لغتِ قرآن ان کے سامنے ہے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے تشریحات کی ہیں تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ علمائے لغت بھی مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجۂ اُتم موجود ہے۔ لہٰذا لغت ومحاورہ سے استفادہ کے لئے چند اُمور کا پیش نظر رہنا ضروری ہے:

① لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے صرف اُن معانی کو پیش نظر رکھا جائے جو زمانہ نزول کے وقت سمجھے جاتے تھے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ عام لغت سے صرفِ نظر کرکے اولاً لغتِ قرآن وسنت کو سامنے رکھا جائے اور پھر عام لغت پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"ویرجع فی ذلك إلى لغة القرآن أوالسنة أوعموم لغة العرب"

''اس کے لئے سب سے پہلے لغتِ قرآن وسنت یا عام اہل عرب کی لغت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔'' (فتاویٰ، ج ۱۳، ص ۳۷۰)

اور ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"والقرآن نزل بلغة قريش الموجودة في القرآن، فإنها تفسير بلغته المعروفة فيه إذ وُجدت لايُعدَل عن لغته المعروفة مع وجودها وإنما يحتاج إلى غير لغته في لفظ لم يوجد له نظير فى القرآن" (فتاویٰ: ج ۱۵/ص ۸۸)

''اور قرآن قریش کی جس زبان میں نازل ہوا وہ جو قرآن میں موجود ہے۔ اس کی اسی معروف لغت کے مطابق تفسیر کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی لفظ اس میں موجود پایا جائے تو اس کی معروف لغت سے انحراف کرنا درست نہیں۔ دوسری لغات کی طرف تب رجوع کیا جائے گا جب اس کی نظیر قرآن میں نہ ملتی ہو۔''

بایں ہمہ قواعدِ اعراب و بلاغت سے اس کے معنی ترکیبی پر غور کرلیا جائے اور سیاق وسباق پر نظر ڈال لی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنی متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

''انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرحِ غریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے: اولاً مواردِ استعمال پر نظر ڈالے اور ترکیبِ کلام اور سیاق وسباق کے اعتبار سے جو معنی زیادہ مناسب نظر آئیں، اُنہیں اختیار کیا جائے۔''

اس ساری تگ و دو کے باوجود یہ معنی اجتہادی ہوں گے اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ بقول شاہ صاحب ایک ہی کلمہ لغتِ عرب میں متعدد معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

② مندرجہ بالا طریق سے جو بھی متعین ہو اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت ﷺ کی ہدی وسیرت کے بھی مطابق ہے؟ اور آپؐ کے اقوال وافعال اور تفسیر صحابہؓ کے منافی تو نہیں ہے، کونی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے؟

یہ تمام غور وفکر اور مساعی اس لئے ضروری ہیں کہ کتبِ لغت بہرحال کتبِ لغت ہیں، ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے۔ وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہرحال قاصر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قرآن کے اصطلاحی الفاظ کی تشریح لغت سے تلاش کرنے کی کوشش کرے

تو یہ اس کا دماغی خلل ہوگا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے تفسیر کی کوشش کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ ابوعبیدہ کی مجاز القرآن ہے۔ دراصل علماءِ بدعت نے اپنے نظریات کی ترویج کے لئے اس طریق تفسیر کو رواج دیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں جس کی مدد سے ہم آیت کا مفہوم متعین کرسکیں۔ ہاں صرف مفردات کی وضاحت کے سلسلہ میں کتبِ لغت کچھ نہ کچھ کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ علامہ طبریؒ لکھتے ہیں:

> ''مفرداتِ قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو لغت کی طرف رجوع ہوسکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہرحال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں ہے۔''

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مواردِ استعمال کا تتبع کسی حد تک مفرداتِ قرآن کے معانی حل کرنے اور سمجھنے میں تو معاون ہوسکتا ہے اور ہے، تاہم یہ ایسا ذریعہ اور عنصر نہیں ہے کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کرسکے یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت ومحاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لئے شواہد تک کو چھان مارا ہے انہوں نے بھی اپنی تفسیروں میں سنت اور اقوالِ صحابہؓ سے اعتنا کیا ہے بلکہ ان کو مقدم رکھا ہے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے احادیث اور اقوال صحابہؓ سے مدد حاصل کی ہے۔

یہ ہیں وہ عناصر یا بنیادی اُصول جن سے قرآن فہمی کے سلسلہ میں بالترتیب اِستفادہ ضروری ہے۔ ان کے علاوہ تاریخ جاہلیت پر عبور بھی قرآن فہمی میں معاون ہوسکتا ہے کیونکہ بعض آیات میں جاہلی تمدن اور ان کی عادات کی تردید مذکور ہے۔

# قرآن فہمی کی راہ میں موانع

☜ قرآن فہمی کے بنیادی اُصول ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ان اُمور کا جاننا ضروری ہے جو قرآن فہمی سے مانع اور حجاب بنتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

''قرآن پاک کتابِ ہدایت ہے لہٰذا اسے کتابِ ہدایت سمجھ کر ہی نہایت توجہ اور تدبر سے پڑھا جائے اور زندگی کے مشکل مسائل کے حل کے لئے اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور قاریٔ قرآن کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے مستغنی رہے۔''

آخر میں فرماتے ہیں:

"وفی الجملة تکون همّته عاكفة على مراد ربه من كلامه"

''الغرض اس کی تمام تر کوشش قرآن کریم سے اللہ کی مراد سمجھنے میں صرف ہونی چاہئے۔''

بعض قارئین تلاوتِ قرآن میں حسن صوت اور اَدائے مخارج میں اس قدر تصنع اور تکلف کرتے ہیں کہ اصل مقصد سے غافل ہو جاتے ہیں اور حسن قراءت کے ایسے مقابلے دراصل قرآن فہمی سے حجاب بنتے ہیں۔ اس طرح اعراب، قواعدِ فصاحت و بلاغت میں استغراق بھی فہم قرآن سے مانع بن جاتا ہے۔ قرآن کے متن پر غور کی بجائے محض تفسیری مطالعہ اور اقوالِ رجال کو جمع کرنے کا مشغلہ بھی وہ حجاب ہے جو قرآن کی روح تک پہنچنے سے مانع رہتا ہے اور جو لوگ قرآن کی تلاوت ہی محض اس لئے کرتے ہیں کہ اپنے خصوصی نظریات کی تائید حاصل کریں وہ ہمیشہ قرآن فہمی سے دور رہتے ہیں۔

ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

"وكل محجوبون بما لديهم عن فهم مراد الله من كلامه فی کثیرمن أو اكثره"

''ایسے تمام لوگ اللہ کے کلام کے اکثر حصہ میں اللہ کی مراد سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔''

ہمارے ملک میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو قرآن سے عدول کر کے الٰہیات کے

مسائل کا حل فلاسفہ اور متکلمین یا صوفیا کی کتابوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ قرآن کے مقابلہ میں ایسی کتابوں کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اس قماش کے مدہوشین کے متعلق فرماتے ہیں: ”وھو لاء أغلظ حجابا عن فھم کتاب الله“

”اس قسم کے لوگ قرآن فہمی سے کوسوں دور ہیں۔“

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن فہمی کی سعادت سے ہمکنار فرمائے اور دلوں کو اپنی رحمت سے نواز دے تاکہ دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کرسکیں۔

عَلَی مِتِی لك علی لله بعزیز

☆ یہ مضمون ماہنامہ محدث لاہور کے اگست ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ جبکہ اس سے قبل دار الحدیث، راجووال کے دورۂ تفسیر منعقدہ ۱۹۷۵ء میں اسے پڑھا گیا تھا۔

# فہم قرآن اور لغتِ عرب

شیخ التفسیر مفتی محمد عبدہ الفلاحؒ

قرآنِ پاک نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ ہر دور میں زندگی کے ہر شعبے میں انسانی عقل وفکر کے لئے رہنما بن سکتا ہے۔ قرآنی مضامین میں اس قدر جامعیت موجود ہے کہ ہر مکتبِ فکر کا آدمی اپنی تسکین کے لئے اس سے مواد حاصل کرسکتا ہے۔

## قرآن کے وسیع مفاہیم کی تعبیر عربی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہے!

اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیری کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ایسی زبان میں نازل کیا جائے جو اس وسعت کی متحمل ہو سکے اور اعجازِ بیان کو اپنے اندر سما سکے۔

یہ محض اِدّعا ہی نہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ اس قسم کی وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے۔ فصاحت و بلاغت کے جو زاویے اس میں ہیں، دیگر سامی اور ایریائی زبانوں کا دامن ان سے یکسر خالی ہے۔ اشتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے، کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ لفظی اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے عربی زبان ہی متجمّع محاسن ہے۔ حتیٰ کہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ ؎

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیس اور معاجم لکھے گئے ہیں، دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ ان معاجم کو دیکھنے سے عربی زبان کی فراخ دامانی اور

جامعیت بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔

'صحاحِ' جوہری کو لیجیے وہ چالیس ہزار مواد (Roots) پر مشتمل ہے۔

'قاموس' فیروز آبادی (متوفی ۸۱۶ھ) میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں ...... اسی طرح

'لسان العرب' میں منظور افریقی (متوفی ۷۱۱ھ) نے اَسّی ہزار مواد سے بحث کی ہے۔

آخر میں 'تاج العروس' کو ملاحظہ فرمایئے جس میں سید محمد مرتضٰی زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) نے اپنے تتبع سے ایک لاکھ بیس ہزار مواد جمع کر دیے ہیں۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن پاک ایسی جامع اور ہمہ گیر کتاب کو، جو اَبدی اور ناقابل انکارِ حقائق پر مشتمل ہے، عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیے تھا اور یہی زبان اس کے لئے موزوں[1] تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اپنے متعلق بار بار بزبانِ عربی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ قرآن کا اُسلوبِ بیان نہایت درجہ 'سہل ممتنع' ہے، اس کے مضامین و مطالب اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں۔

چنانچہ آیات نمبر: ۱۲/۲، ۱۳/۳۷، ۱/۸، ۱۲/۲، ۴۲/۳، ۲۶/۹۵ وغیرہ میں قرآن نے خود عربی ہونے کا دعویٰ کیا جس کے معنی ہیں واضح اور صاف کیونکہ لفظ ع ر ب میں اظہار اور وضاحت کے معنی پائے جاتے ہیں۔

## تفسیر قرآن کے لئے عربی زبان جاننا ہی کافی نہیں!

بلاشبہ قرآنِ پاک عربی زبان میں نازل ہوا اور عرب اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے عام طور پر اس کے مطالب و معانی کا ادراک بآسانی کر لیا کرتے تھے۔ بلکہ قرآن کے اُسلوبِ بیان سے محظوظ ہوتے اور الفاظ کی بندش اور ان کے محتویات ہی سے متاثر ہو کر اس کی صداقت کے قائل ہو جاتے، مگر عربوں کی مادری زبان میں نازل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر آیت کے مفہوم کا کماحقہٗ اِدراک کر لیتے تھے اور ان کے سامنے قرآن کی تشریحات کی ضرورت نہ تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت باقاعدہ طور پر آں حضرت ﷺ یا اپنے ہم طبقہ علما سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتی رہی۔ ان کا معمول تھا کہ دس آیات پڑھنے کے بعد جب تک

ان کے مطالب پوری طرح ذہن نشین نہ کر پاتے اور عملی طور پر انہیں اپنا نہ لیتے، اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۳)۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے پورے دس سال کے عرصہ میں سورۃ البقرۃ پڑھی اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے ۸ سال میں یہ سورۃ ختم کی۔ ظاہر ہے کہ یہ محض نظم قرآن کی قراءت یا تجوید نہ تھی، بلکہ اس کے مطالب کا ادراک اور اس پر عمل بھی اس میں شامل تھا۔ (المسوی شرح مؤطا: ۲/۳۱۳)

اسی طرح آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جنہوں نے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رکھا، ان میں سے عبداللہ بن مسعودؓ (متوفی ۳۲ھ)، عبداللہ بن عباسؓ (متوفی ۶۸ھ)، اُبی بن کعبؓ (متوفی ۳۰ھ) اور زید بن ثابتؓ (متوفی ۴۱ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور تفسیری سلسلۂ سند بھی زیادہ تر اِنہی پر منتہی ہوتا ہے۔ ان صحابہؓ سے تابعین کی ایک جماعت نے تفسیر قرآن کا علم حاصل کیا۔ حتیٰ کہ دورِ تدوین تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح تفسیر قرآن کا معتد بہ حصہ ہم تک بذریعہ روایت پہنچا۔

## تفسیر قرآن میں لغتِ عرب سے استفادہ پر لکھی گئی کتب

غریب القرآن کا کتبِ لغت سے حل تلاش کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

① علماء لغت نے اپنی کتابوں میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہرحال تتبع اور استقرا کے بعد کیا ہے، بایں وجہ ان کے مابین الفاظ کے مفاہیم بیان کرنے اور محاورات کے نقل کرنے میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔

② ان علما نے عام عربی زبان کو سامنے رکھ کر کتبِ لغات ترتیب دی ہیں، خصوصیت کے ساتھ قرآنی الفاظ ان کے پیش نظر نہیں تھے اور یہ ضروری نہیں کہ عام زبان میں کسی لفظ کا جو معنی مراد لیا جاتا ہے، قرآن میں بھی وہی مراد ہو۔

③ جن علما نے غریب القرآن کو پیش نظر رکھ کر الفاظ کی لغوی تشریحات لکھی ہیں وہ مختلف مسلک اور ذوق رکھتے ہیں اور انہوں نے مفردات کی تشریح کے وقت اپنے مسلک کو پیش

نظر رکھا ہے، ایسے لوگ متکلمین میں بھی ہو گذرے ہیں اور فقہا میں بھی، لہٰذا ان تفاسیر یا کتبِ لغت کا مطالعہ کرتے وقت مؤلف کے ذہن اور مسلک کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ 'الفوز الکبیر' میں لکھتے ہیں:

''انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرح الغریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے اور مواردِ استعمال پر نظر ڈالے اور پھر یہ دیکھے کہ آیت کے سیاق وسباق اور اس جملہ کے باقی اجزاء کی مناسبت سے کون سا معنی اقوی اور ادنیٰ ہے پھر سیاق وسباق کے لحاظ سے جو معنی انسب نظر آئے، اسے اختیار کر لینا چاہئے۔ (الفوز الکبیر: ص۴،۶)

④ تتبعِ لغت سے مفرداتِ قرآن کا جو مفہوم بھی متعین کیا جائے گا وہ مفہوم بہرحال اجتہادی ہوگا جس میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے، اس لئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

فهٰهنا أيضا مدخل للعقل وسعة للاختلاف لأن الكلمة الواحدة تجيئ في لغة العرب لمعان شتى

''لہٰذا شرحِ غریب میں عقل دخیل ہوتی ہے اور اختلاف کی گنجائش پائی جاتی ہے، کیونکہ عربی زبان میں ایک ہی لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔''

⑤ کتبِ لغت کے تتبع سے مفرداتِ قرآن کا صرف لغوی حل تو مل سکتا ہے، مگر ان سے یہ رہنمائی نہیں مل سکتی کہ اس لفظ سے قرآن کون سا تصور پیش کرنا چاہتا ہے اور اس کے محتویات کیا ہیں، چنانچہ علامہ طبریؒ اپنی تفسیر 'جامع البیان' میں لکھتے ہیں:

''الفاظِ قرآنی کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو کتبِ لغت کی طرف رجوع کیا جائے گا، مگر آیات کے مفہوم کا پتہ چلانے کے لئے کتبِ لغت کی بجائے وحی الٰہی اور سنتِ نبویؐ سے راہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ﴾ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ مثلاً کسی اہل زبان (عرب) کے سامنے جب یہ آیۂ کریمہ ﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ قَالُوْا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ کی جائے تو جس حد تک لفظ 'فساد' اور 'اصلاح' کے لغوی معانی کا تعلق ہے، اسے وہ خوب سمجھ سکتا ہے مگر وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ کون سے اُمور موجبِ اصلاح ہیں اور کون سے موجبِ فساد؟ یہ بات تو وہی بتا سکتا ہے جس پر قرآن نازل ہوا ہے۔'' (ماخوذ از تفسیر طبری: ج۱ ص۳۳،۳۴)

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ کتبِ لغت سے الفاظ کے موارِدِ استعمال کے تتبع

سے کسی حد تک مفردات کے حل میں تو مدد مل سکتی ہے، مگر یہ ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے صرفِ نظر کر کے محض اسی کو مدار قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس عنصر سے فی الجملہ استفادہ کیا ہے، صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ چنانچہ تفسیر طبری، الکشاف للزمخشری اور 'بحر محیط' لابی سفیان، جو اسی سلسلہ کی بہترین تفاسیر شمار ہوتی ہیں اور ان میں لغوی تشریحات اور شواہد کا خاصا مواد موجود ہے، انہوں نے بھی تفسیر کرتے وقت کتاب وسنت اور اقوالِ صحابہؓ کو مدنظر رکھا ہے تاہم بعض علما نے شرح الغریب کا خصوصی اعتنا بھی کیا ہے اور 'مفرداتِ راغب' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، لہٰذا تفاسیر کے اس سلسلہ کے متعلق ہم بھی کچھ عرض کریں گے۔

① غریب القرآن پر جن علما نے توجہ دی ہے، ان میں سب سے پہلے حبر الأمة حضرت ابن عباسؓ ہیں۔ چنانچہ 'غریب القرآن' کے نام سے ایک تفسیر بھی ان کی طرف منسوب[2] ہے۔ اسی طرح 'التفسیر الاکبر' ہے جو ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے، اس میں علی بن ابی طلحہؓ اور ابن کلبی کی روایت سے مفرداتِ قرآن کی تشریحات منقول ہے۔[3] چنانچہ علی بن ابی لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابو صالح کاتب اللیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطہ سے روایت کرتے تھے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ نے اس کی تحسین کی ہے۔[4]

ان تفسیروں کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو، مگر اس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ وہ مفرداتِ قرآن کی تشریحات کے سلسلہ میں شعر اور کلامِ عرب سے استشہاد کرتے تھے۔

② غریب القرآن کے سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کے بعد ابان بن ثعلب بن رباح جریری، ابوسعید اکبری مولیٰ بنی جریر بن عباد ابوامامہ (۱۴۱ھ) کا نام لیا جاتا ہے جن سے امام مسلم اور اصحابِ سنن روایت کرتے ہیں، انہوں نے بروایتِ ابوجعفر اور ابوعبداللہ 'غریب القرآن' میں ایک تفسیر مرتب کی جس میں شعرائے عرب کے کلام سے شواہد پیش کیے۔[5]

ان کے بعد بہت سے علما نے 'معانی القرآن'، 'اعجاز القرآن' اور 'غریب القرآن' کے نام سے تفاسیر لکھیں جو کہ الفہرست از ابن ندیم، کشف الظنون از حاجی خلیفہ اور مفتاح السعادۃ

میں مذکور ہے۔

جن علما نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں، ان میں سے ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (۲۰۷ھ)، ان کے تلمیذ ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یحییٰ نیریدی (۲۶۰ھ)، ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ تمیمی (۲۱۰ھ)، ابواسحٰق ابراہیم بن محمد سری زجاج (۳۱۰ھ) اور امام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن تین ناموں سے کتابیں تصنیف کیں جن میں سے 'مجاز القرآن' از ابوعبیدہ طبع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب ترتیبِ مصحف پر ہے، مگر فراء کی 'معانی القرآن' اس سے زیادہ اہم ہے، اس لئے کہ فراء علم وعقیدہ کے اعتبار سے ابوعبیدہ سے زیادہ راسخ تھے اور انہوں نے یہ کتاب اپنے تلمیذ عمر بن بکیر کی درخواست پر اِملا کروائی تھی۔ چنانچہ ابن ندیم الفہرست ص۱۰۶ پر لکھتے ہیں:

وله من الكتب كتاب معاني القرآن ألفه لعمر بن بكير أربعة اجزاء

"فراء نے 'معانی القرآن' عمر بن بکر کے لئے تصنیف کی تھی جو چار اجزا پر مشتمل ہے"

ابن قتیبہ دینوری، اسحٰق بن راہویہ اور ابوحاتم سجستانی کے شاگرد ہیں۔ موصوف نے اس موضوع پر 'غریب القرآن' اور 'مشعل القرآن' دو کتابیں تصنیف کیں اور یہ دونوں 'القرطین' کے نام سے طبع ہوکر مصر سے شائع ہوچکی ہیں۔

امیر قنوجی (۱۳۰ھ) نے 'الاکسیر' میں ابن قتیبہ کو تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے۔ ابوعبیدالقاسم بن سلام کی 'غریب القرآن' کا تذکرہ الفہرست از ابن ندیم میں بھی ملتا ہے۔ نیز ابن ندیم نے لکھا ہے کہ "موصوف نے 'معانی القرآن' کے نام سے بھی ایک تفسیر لکھی ہے۔" (الفہرست ص۱۱۲)

ابوعبدالرحمٰن یزیدی نے بھی 'غریب القرآن' کے نام سے اس موضوع پر کتاب لکھی ہے۔

(الفہرست: ص۸۸)

سمعانی 'کتاب الانساب' میں لکھتے ہیں کہ

"یزیدی کی یہ کتاب نہایت جامع ہے، علامہ قنطی نے 'الانباہ' میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔"

(الانباہ للقنطی: ج۲/ص ۱۵۱)

امام راغبؒ کی تصنیف 'مفردات القرآن' جس کے ترجمہ کی سعادت راقم الحروف نے حاصل کی ہے، تقریباً پندرہ سو اُناسی مواد پر مشتمل ہے۔ گویا قرآن کے کل مواد ۱۶۵۵ میں سے

صرف ۶۶ متروک ہیں۔ مصنف نے اپنی کتاب کو حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروفِ اصلیہ میں سے پہلے حرف کی رعایت رکھی ہے۔ طریق بیان فلسفیانہ ہے۔ یعنی اوّلاً ہر مادہ (Root) کے اصل معنی متعین کرتے ہیں۔ پھر اس اعتبار سے وہ لفظ قرآن میں جتنے مقامات پر استعمال ہوا ہے، اسے اصل معنی کی طرف لوٹاتے ہیں، تشریحِ لغت میں یہ طریق اُصولی حیثیت رکھتا ہے اور اسے اختلاف کی صورت میں کسوٹی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر مصنف ہر کلمہ کی تشریحات کے سلسلہ میں ان تمام آیات کے اِحصا کی کوشش کرتے ہیں جن میں وہ کلمہ استعمال ہوا ہے تاکہ آیات کے سیاق وسباق سے صحیح مفہوم سامنے آجائے اور اس میں کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔

امام راغب کے بعد متاخرین نے بھی غریب القرآن پر مستقل تصانیف لکھی ہیں جن میں سے 'تحفۃ الاریب بمافی القرآن من الغریب' لابی حیان محمد بن یوسف اندلسی (۷۴۵ھ)، 'تراجم الاعاجم' تالیف زین المشائخ محمد بن ابوالقاسم خوارزمی (۵۶۲ھ) اور 'مفردات القرآن' از شہاب الدین احمد بن یوسف المعروف بسمین حلبی (۷۶۵ھ) خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ مگر ان سب کتابوں میں 'مفردات' امام راغب کو جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے، وہ کسی دوسری کتاب کو نہیں، بلکہ یوں کہئے کہ باقی سب کتابیں مردہ ہوچکی ہیں اور صرف مفرداتِ راغب ہی زندہ ہے۔ عَلَی ﷺ (شائع شدہ ماہنامہ محدث، ستمبر ۲۰۰۳ء

تنظیم اہل حدیث: ج ۱۶/عدد ۳۰: بابت ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء)

حوالہ جات

① ملاحظہ ہو، فیض الخبیر علی نہج التیسیر بحث ترجمۃ القرآن: ص ۳۲، ۳۳

② بروکلمین اپنی 'تاریخ' میں لکھتے ہیں کہ دوسری عالمگیر جنگ سے قبل برلن لائبریری میں اس کا نسخہ تھا، ۱/۲۱۷

③ شیخ الاسلام طارق حکمت اللہ حسینی کے مکتبہ مدینہ منورہ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ ملاحظہ ہو مقدمہ الصحاح از جوہری، نیز ملاحظہ ہو: الفوز الکبیر ص ۱۱

④ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الاتقان للسیوطی: ج ۲/ص ۱۸۸، ۱۸۹، فتح الباری ج ۱/ص ۲۱، اکسیر المذاہب الصحاح ص ۱۱۰ ومفتاح السعادۃ لطاش بری زادہ: ج ۱/ص ۴۰۱ر، الحاوی: ج ۲/ص ۴۶

⑤ ملاحظہ ہو: المعجم الوقت: ج ۱/ص ۱۰۰۸، السنہ: ص ۱۷۶، ۱۷۷، کشف الظنون: ج ۷/ص ۱۰۷ اور فہرست کتبِ شیعہ للطوسی: ص ۴ ج ۱

# تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ

## قرآن وسنت

تفسیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر، خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن میں جو مضمون ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل ملے گا، اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے، دوسری جگہ اس کی تفصیل مل جائے گی اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے جو قرآن کی شرح وتفسیر کرتی ہے، بلکہ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعیؒ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حکم بھی دیا ہے، وہ قرآن ہی سے ماخوذ[1] ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ وَلاَ تَكُنْ لِلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا﴾(النساء:١٠٥)

''بلا شبہ اُتاری ہم نے تیری طرف کتاب سچی تا کہ تو اس کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جو سمجھا دے تجھ کو (اے نبی ﷺ) اللہ، اور مت ہو تو خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والا۔''

اور فرماتا ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾(النحل:٤٤)

''اور ہم نے یہ کتاب تیری طرف اُتاری تا کہ وضاحت کرے تو لوگوں کے لئے ان مضامین کی جو ان کی طرف اتارے گئے ہیں، اور تا کہ وہ غور کیا کریں۔''

﴿وَمَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ إِلاَّ لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ

يُؤْمِنُوْنَ﴾(النحل ۸:۱۴)

''اور ہم نے تم پر (اے نبی ﷺ) یہ کتاب اسی لئے نازل کی ہے کہ تم کھول کر بتا دو (ان کو وہ باتیں جن میں یہ باہم مختلف ہیں) اور نیز یہ ہدایت اور رحمت ہے، ایمان والوں کے لئے۔''

اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''معلوم ہے کہ مجھے قرآن بھی بخشا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی۔''[۲] اور یہ مثیلِ قرآن 'سنت' ہے۔ سنت بھی نازل ہوتی تھی، البتہ قرآن کی طرح اس کی تلاوت نہیں رکھی گئی۔ امام شافعیؒ وغیرہ نے اسے بکثرت دلائل سے واضح کیا ہے، جس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر، خود قرآن ہی سے طلب کرو اور اگر نہ پاؤ تو سنت میں تلاش کرو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا تھا، جب انہیں یمن روانہ کرنے لگے، ''کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟'' معاذؓ نے عرض کیا: کتاب اللہ سے، فرمایا: ''اور اگر اس میں نہ ملے؟'' معاذؓ نے عرض کیا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ سے۔ فرمایا: ''اگر سنت میں بھی نہ پایا؟'' عرض کیا تو اس صورت میں اپنے اجتہادِ رائے سے کام لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر معاذؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''خدا کا شکر، جس نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو وہ توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے!'' یہ حدیث اچھی اسناد کے ساتھ کتبِ مسانید وسنن میں موجود ہے۔[۳]

## اقوالِ صحابہؓ

لیکن جب ہمیں قرآن اور سنت میں تفسیر نہ ملے، تو ہمیں اس کی جستجو اقوال صحابہؓ میں کرنا چاہئے، کیونکہ مخصوص قرائن و حالات کے مشاہدے کی وجہ سے وہ مطالبِ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، اور مکمل فہم و عملِ صالح کے مالک تھے، خصوصاً ان کے علماء واکابر، جیسے خلفاے اربعہؓ اور ہدایت یافتہ ائمہ، جیسے عبداللہ بن مسعودؓ۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے: ''قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت نازل نہیں

ہوئی، جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہے اور کہاں نازل ہوئی ہے۔ اگر میں کسی ایسے شخص کو جانتا، جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے، اور اس کے پاس سواری سے پہنچا جا سکتا، تو میں ضرور اس کے پاس جا پہنچتا۔"[۴]

اور اعمش[۵] نے اپنی سند سے انہی عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول روایت کیا ہے:

"ہم میں سے کوئی جب دس آیتیں پڑھتا تھا، جب تک ان آیتوں کے معانی کی معرفت حاصل نہ کر لے اور ان پر عمل میں بھی پختہ نہ ہو جائے۔"[۶]

انہی ہدایت یاب ائمہ میں رسول اللہ ﷺ کے ابن عم، ترجمان القرآن حبر الائمہ عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی برکت دُعا سے بحر العلوم بن گئے تھے۔ فرمایا تھا:

"خدایا! اسے دین میں تفقہ اور قرآن کا فہم بخش دے۔"[۷]

ابن جریرؒ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے: "ابن عباسؓ قرآن کے کیا ہی خوب ترجمان ہیں!"[۸] عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول، ابن عباسؓ کے حق میں کئی طریقوں سے مروی ہے، لہٰذا یقین ہے کہ ابن مسعودؓ نے یہی کہا تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کا انتقال ۳۳ھ میں ہوا۔ صحیح روایت یہی ہے، لیکن عبداللہ بن عباسؓ ان کے بعد بھی چھتیس سال زندہ رہے۔ اندازہ کریں کہ ابن مسعودؓ کے بعد اس طویل مدت میں عبداللہ بن عباسؓ کے علوم میں کتنا بہت اضافہ ہو گیا ہو گا؟ اعمش سے ابو وائلؒ[۹] نے بیان کیا کہ

"امیر المؤمنین علیؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور عبداللہؓ نے اپنے خطبے میں سورۂ بقرہ (یا سورۂ نور) تلاوت کر کے ایسی تفسیر بیان کی کہ اگر روم، ترک، دیلم کے کفار بھی سن لیتے، تو ضرور اسلام لے آتے۔"[۱۰]

## اسرائیلی روایات

اسماعیل[۱۱] بن عبدالرحمٰن سدی (کبیر) اپنی تفسیر میں زیادہ تر ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ ہی کے اقوال روایت کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات ان کی زبانی اہل کتاب کے اقوال بھی نقل کر جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے، فرمایا

"میری طرف سے دوسروں کو پہنچاؤ اگر وہ ایک آیت ہی ہو، اور بنی اسرائیل سے روایت

کرنے میں حرج نہیں، لیکن جو کوئی جان بوجھ کر میری نسبت جھوٹ بولے، دوزخ میں اپنا ٹھکانا بھی بنالے۔" یہ حدیث بخاری نے عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے۔[۱۴]

انہی عبداللہ بن عمروؓ کو جنگِ یرموک میں اہل کتاب کی کتابوں کے دو بوجھ دستیاب ہو گئے تھے، اور وہ اسی حدیث سے اجازت سمجھنے کی بنا پر ان کتابوں سے روایت کرنے لگے تھے۔

**اسرائیلی روایات کی حیثیت:** لیکن یہ یاد رہے کہ اسرائیلیات، استشہاد کے لئے تو روایت کی جاسکتی ہیں، مگر اعتقاد کے لئے نہیں، کیونکہ اسرائیلیات تین قسم کی ہیں، وہ جن کی صحت ہمارے پاس کی ہدایت سے معلوم ہوچکی ہے، تو ان کی ہم تصدیق کرتے ہیں، اور وہ جن کا جھوٹ ہمارے پاس کی ہدایت سے ثابت ہے، ظاہر ہے ہم ان کے بطلان کے قائل ہیں، اور تیسری قسم ایسی ہے جس کے بارے میں ہماری ہدایت خاموش ہے، نہ تصدیق کرتی ہے نہ تکذیب، تو ایسی اسرائیلیات پر ہم نہ ایمان رکھتے ہیں، نہ انہیں جھٹلاتے ہیں۔ ان کی روایت زیادہ سے زیادہ استشہاد کے لئے جائز ہوسکتی ہے۔

**اسرائیلیات کی افادیت؟** لیکن اکثر و بیشتر اسرائیلیات ایسی ہیں کہ ان سے دین میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اسی لئے خود علماءِ اہل کتاب کا بھی ان میں بڑا اختلاف ہے، لیکن ان اسرائیلیات کی وجہ سے بھی مفسرین میں اختلاف پڑ گیا ہے، جیسا کہ یہ اختلاف کہ اصحابِ کہف کے نام کیا تھے؟ ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا؟ ان کی تعداد کتنی تھی؟ یا یہ کہ عصائے موسیٰ علیہ السلام کس درخت کی لکڑی کا تھا؟ وہ کون پرندے تھے جنہیں خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے زندہ کردیا تھا؟ گائے کا وہ کون سا حصہ تھا، جس سے مقتول کو مارا گیا تھا؟ اور وہ کون سا درخت تھا، جس میں سے خدا نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا؟ وغیرہ اُمور جنہیں خدا نے قرآن میں مبہم رکھا ہے، اور ان کے علم سے کسی کو دنیا میں یا دین میں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا، مگر اس بارے میں اہل کتاب کا اختلاف نقل کرنا جائز ہے، جیسا کہ خود خدا نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے:

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّىْٓ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾(کہف ۲۲:۳)

’’بعض کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور چوتھا ان کا کتا، اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا کتا، یہ لوگ بے تحقیق بات ہانک رہے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے۔ (نبی ﷺ!) کہہ دو، میرا ربّ ان کا شمار خوب جانتا ہے، تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں۔ تم سرسری گفتگو ہی اس سلسلے میں کرو اور کسی سے بھی اس کے متعلق دریافت نہ کرو۔‘‘

اس آیتِ کریمہ نے ہمیں سکھایا ہے کہ ایسے مقام میں کس ادب سے کام لینا اور کون سی روش اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے تین اقوال کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلے دو قولوں کی تضعیف فرمائی ہے اور تیسرے قول پر سکوت برتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی قول صحیح ہے، اس لئے کہ اگر یہ باطل ہوتا، تو پہلے دونوں اقوال کی طرح اس کی بھی تردید فرما دی جاتی۔ پھر ہماری اس طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اصحابِ کہف کی تعداد کا جاننا بے فائدہ ہے، اور ایسے موقع پر ہمیں بس یہ کہہ دینا مناسب ہے: ﴿قُلْ رَبِّیْ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ﴾ یہ اس لئے کہ ان کی صحیح تعداد کم ہی لوگوں کو معلوم ہے، اور یہ لوگ وہی ہیں، جن پر اللہ نے یہ چیز ظاہر فرمائی ہے، اسی لئے فرمایا: ﴿فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا﴾ یعنی اس بے فائدہ بحث میں اپنے آپ کو نہ ڈالو اور لوگوں سے پوچھ گچھ بھی نہ کرو، کیونکہ انہیں اصلیت کی خبر نہیں، محض اٹکل پچو باتیں کیا کرتے ہیں۔

اس آیت نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی کہ جب کسی مختلف فیہ واقعہ کا تذکرہ کرو تو اسی جگہ تمام اقوال کا بھی تذکرہ کر کے صحیح قول کی طرف اشارہ کر دیا کرو تاکہ بحث طول نہ پکڑے، اور لوگ بے فائدہ قیل وقال میں پڑ کر اہم مسائل سے غافل نہ ہو جائیں۔

جب کسی مسئلے میں آدمی اختلاف کا تذکرہ کرتا ہے اور لوگوں کے تمام اقوال جمع نہیں کرتا تو کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے، اس لئے کہ ممکن ہے وہی قول حق ہو، جسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر اختلاف کا ذکر کر کے صحیح قول کو بیان نہیں کرتا، تو بھی نقص کا شکار ہوتا ہے، اور اگر عمداً غیر صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو کذب کا گناہ کرتا ہے، اور اگر جہل کی راہ سے ایسا کرتا ہے، تو غلطی کا شکار ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص طویل اختلاف کا ذکر کرتا ہے، یا ایسے بہت سے اقوال نقل کرنے بیٹھ جاتا ہے جو معنی کے لحاظ سے ایک دو قول ہی ہوتے ہیں، تو اپنا وقت برباد کرتا ہے، اور جو کوئی غیر صحیح اقوال جمع کرتا ہے، دغا بازی کا مرتکب ہوتا ہے۔ واللہ الموفق للصواب

## اقوالِ تابعینؒ

اور جب تفسیر نہ قرآن میں ملے، نہ سنت میں، نہ اقوالِ صحابہؓ میں؛ تو ایسی صورت میں بہت سے ائمہ، اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کرتے ہیں، مثلاً مجاہد بن جبیرؒ کی طرف جو علم تفسیر میں خدا کی ایک نشانی تھے۔ محمد بن اسحٰقؒ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ مجاہدؒ کہتے تھے:

''میں نے مصحف قرآنی شروع سے آخر تک تین مرتبہ عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش کیا۔ ہر آیت پر انہیں ٹھہراتا اور تفسیر پوچھتا تھا۔[13]''

اور ترمذی نے اپنی اسناد سے مجاہد کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ

''قرآن میں کوئی آیت نہیں، جس کی تفسیر میں کچھ نہ کچھ میں نے سنا نہ ہو۔''

ترمذی ہی کی روایت ہے کہ مجاہدؒ نے کہا

''اگر میں نے عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت لی ہوتی، تو قرآن کے بارے میں ابن عباسؓ سے بہت کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔[14]''

ابن جریر نے ابن ابی ملکیہ[15] سے روایت کیا ہے کہ میں نے مجاہدؒ کو دیکھا کہ اپنے کاغذ لئے ابن عباسؓ کے پاس پہنچے اور تفسیر قرآن کے بارے میں سوال کرنا شروع کیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا: لکھتے جاؤ، اسی طرح مجاہد نے پوری تفسیر پوچھ لی۔ اسی لئے سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے: ''جب مجاہدؒ سے تفسیر ملے، تو یہ تمہارے لئے کافی ہے۔[16]''

اسی طرح دوسرے تابعین و تبع و تابعین ہیں جن کا پایہ تفسیر میں بلند ہے، مثلاً سعید بن جبیرؒ، عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ، عطاء بن ابی رباحؒ، حسن بصری[17]، مسروق بن الاجدع[18]، سعید بن مسیّب، ابوالعالیہ، ربیع[19]، قتادہ[20]، ضحاک[21] بن مزاحم رحمہم اللہ وغیرہ اور ان کے بعد کے علماء صالحین وغیرہ

## مختلف اقوال میں تطبیق کی ضرورت

آیت کی تفسیر میں اہل علم حضرات کے اقوال نقل تو کرنے چاہئیں، مگر ان اقوال کے مختلف لفظ دیکھ کر بے علم لوگ اس وہم میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ان کا آپس میں اختلاف ہے، اور اسی وہم کی بنا پر ان اقوال کو اختلافات کہہ کر پیش کرنے لگتے ہیں، حالانکہ امر واقعہ یوں نہیں ہوتا۔

کسی قول میں ایک چیز کے لازم یا نظیر کو بیان کیا ہوتا ہے، اور کسی قول میں بعینہٖ اسی چیز کا تذکرہ ہوتا ہے۔ الفاظ تو مختلف ہوتے ہیں، مگر معناً ان میں اختلاف نہیں ہوتا، بلکہ ایک ہی چیز کا جدا جدا لفظوں میں بیان و اظہار ہوتا ہے۔ سلف کی تفسیروں میں ایسا بہت نظر آتا ہے۔ لہٰذا اسے سمجھنا اور خیال میں رکھنا چاہئے۔ عَلَیٰ اللہ الہِدایۃ

شعبہ[۴۲] بن حجاجؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ تابعین کے اقوال جب فروعِ احکام میں حجت نہیں، تو تفسیر قرآن میں کیونکر حجت ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ خلاف جانے والوں پر حجت نہیں ہوں گے، اور یہ صحیح ہے، لیکن جب تابعین کا اجماع ہو جائے، تو بلا شبہ وہ حجت ہے۔ ہاں جب ان میں اختلاف ہو، تو ایک تابعی کا قول نہ دوسرے تابعی پر حجت ہوگا، نہ بعد والوں پر بلکہ ایسی صورت میں تفسیر کرتے ہوئے قرآن و سنت کی زبان کو، اقوالِ صحابہؓ کو یا عام لغت عرب کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

# تفسیر بالرائے حرام ہے!

محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے۔ ابن عباسؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے، اپنے لئے دوزخ میں ٹھکانا بنالے۔'' یہی حدیث ایک اور سند سے بھی ابن عباسؓ سے روایت ہوئی ہے۔[۴۳]

سنن ترمذی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

''جو کوئی اپنی رائے سے قرآن میں کچھ کہے اور اس کا کہنا صحیح ہو، تو بھی وہ غلطی کا مرتکب ہے۔''

ترمذی نے اس حدیث کو غریب[۴۴] بتایا ہے، اور بعض علمائے حدیث نے اس کے ایک راوی سہیلؒ بن ابی حزم کے ثقہ ہونے میں کلام کیا ہے۔[۴۵]

ممانعت کی انہی حدیثوں کی بنا پر بعض اہل علم نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کے صحابہ اس بارے میں سخت تھے کہ کوئی شخص بغیر علم کے تفسیر قرآن کرنے بیٹھ جائے، مجاہد اور قتادہ وغیرہ علما نے بیشک تفسیریں کی ہیں، لیکن ان کے حق میں گمان نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے بغیر علم کے یا

محض اپنی رائے سے تفسیر کردی ہے، اور کھلی بات ہے کہ جو شخص محض اپنی رائے و خیال سے تفسیر کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، ایک ایسی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے، جس کا اسے کوئی علم نہیں، اور ایسی راہ چلتا ہے، جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا۔ اب اگر وہ کوئی تفسیر صحیح بھی کر جاتا ہے، تو بھی غلطی ہی میں پڑا رہتا ہے، کیونکہ سرے سے ہی غلط راہ چلا ہے۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو جہل کی حالت میں لوگوں کے فیصلے کرنے بیٹھ جاتا ہے اور دوزخ میں جا گرتا ہے، اگرچہ اتفاق سے اس کا فیصلہ فی نفسہٖ درست بھی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ صحیح فیصلے کی صورت میں جرم اس سے ہلکا رہے گا۔ اگر فیصلہ بھی غلط ہو تو اس کا جرم شدید تر ہے!

یہ اُصول ہمیں قرآن مجید سے ملتا ہے، دیکھئے بدکاری کا الزام لگانے والوں کو خدا نے جھوٹا قرار دیا ہے۔ فرمایا:

﴿فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ (النور:۱۳)

”اگر (زنا کے الزام کے لئے) چار گواہ نہ لاسکیں تو الزام لگانے والے جھوٹے ہیں۔“

پس شاہد نہ لانے والا، بہتان تراش، جھوٹا ہے، اگرچہ فی نفسہٖ بدکاری کے مرتکب ہی پر الزام لگا رہا ہو، کیونکہ ایسی بات منہ سے نکالتا ہے، جو اس کے لئے جائز نہیں اور ایسی بات کہتا ہے، جس کا اسے علم نہیں، یا جسے ثابت نہیں کرسکتا۔ واللہ اعلم

## تفسیر بالرائے سے سلف صالحین کا گریز کرنا

اسی لئے سلف صالحین ایسی تفسیر سے قطعی گریز کرتے تھے، جس کا علم نہیں ہوتا تھا۔

① شعبہؒ کی روایت ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: ”کون زمین مجھے اُٹھائے گی اور کون آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر کتاب اللہ میں ایسی بات کہوں، جس کا مجھے علم نہیں[۲۶]۔“ امام ابوعبید ابراہیم تیمیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ سے ﴿وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ (عبس:۳۱) کے بارے میں سوال کیا گیا، جواب میں کہنے لگے:

”کون زمین مجھے اُٹھائے گی اور کون آسمان مجھ پر سایہ کرے گا، اگر کتاب اللہ میں ایسی بات منہ سے نکالوں جس کا مجھے علم نہیں۔“

② نیز امام ابوعبید بن سلامؒ[27] ہی حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ منبر پر تھے کہ پڑھا ﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ پھر کہنے لگے: فاکھة تو ہم جانتے ہیں، مگر اَبّ کیا ہے؟ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے: ''اے عمر! خواہ مخواہ کی کرید اِسی کو کہتے ہیں!'' امام عبد بن حمیدؒ نے انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھے۔ ہم نے دیکھا ان کے کرتے کی پیٹھ پر چار پیوند لگے ہیں۔ پھر انہوں نے پڑھا: ﴿وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ اور کہنے لگے ''یہ ابّ کیا ہے؟'' پھر خود ہی کہا:

''اسی کو تکلیف کہتے ہیں۔ تو اگر نہیں جانتا، تو حرج بھی کیا ہے۔''[28]

ان روایتوں کا مطلب یہ ہے کہ حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کے سامنے ابّ کی کیفیت سے بحث تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ جانتے تھے کہ 'ابّ' زمین کی ایک نبات ہے۔ ابّ کا نبات ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ خدا فرماتا ہے:

﴿فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلاً وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا﴾ (عبس:۲۷ تا ۳۰)

''پھر اُگایا ہم نے ان میں اناج اور انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجوریں اور باغ گھنے۔''

③ ابن جریرؒ کی روایت ہے کہ ''ابن عباسؓ سے ایک ایسی آیت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ اگر تم میں سے کسی سے کیا جاتا تو ضرور جواب دیتا، مگر ابن عباسؓ نے کچھ کہنے سے صاف انکار کردیا۔''[29] اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔

④ امام ابوعبیدؒ نے ابن ابی ملیکہؒ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے سوال کیا: اس ارشادِ قرآنی میں دن سے کیا مراد ہے؟ ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (الم السجدۃ:۵) ''ایسا دن جس کا اندازہ ہزار سال ہے۔'' تو ابن عباسؓ نے اس شخص سے اُلٹا سوال کیا اور پوچھا: یہ دن کون سا ہے ﴿يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج:۴) اس پر وہ شخص کہنے لگا: ''میں پوچھ رہا ہوں تاکہ آپ مجھے بتائیں۔'' ابن عباسؓ نے جواب دیا:

''یہ دو دن ہیں، جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، اور اللہ ہی ان دنوں کی حقیقت بہتر جانتا ہے۔''[30]

⑤ ابن جریرؒ کی روایت ہے کہ طلق بن حبیبؒ حضرت جندبؓ بن عبداللہ کے پاس آئے اور قرآن کی ایک آیت کے بارے میں سوال کیا۔ جندبؓ نے جواب دیا:

''میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ اگر مسلمان ہو، تو میرے پاس سے اُٹھ جاؤ!''[31] (یا کہا کہ میرے پاس مت بیٹھو)

⑥ امام مالکؒ[32] کہتے ہیں، یحییٰ بن سعید نے سعید بن مسیّبؒ کے بارے میں بیان کیا کہ جب ان سے کسی قرآنی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی، تو فرماتے ''ہم قرآن کے معاملے میں کچھ نہیں کہتے۔''[33] انہی یحییٰ بن سعیدؒ کا قول ہے کہ سعید بن مسیّبؒ قرآن کے معلوم حصوں پر ہی گفتگو کرتے تھے[34] عمرو بن مرہؒ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے سعید بن مسیّبؒ سے کسی آیت کی تفسیر دریافت کی، تو کہنے لگے: ''قرآن کے بارے میں مجھ سے نہیں بلکہ اس شخص سے سوال کرو، جس کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی کوئی بات بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔'' یہ اشارہ عکرمہؒ کی طرف تھا۔[35] یزید بن ابی یزید کہتے ہیں کہ ہم سعید بن مسیّبؒ سے حلال وحرام کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے، اس چیز کا انہیں سب سے زیادہ علم تھا، لیکن جب ہم کسی آیت کی تفسیر دریافت کرتے، تو اس طرح چپ ہو جاتے، گویا سنا ہی نہیں۔[36]

⑦ ابن جریرؒ کی روایت ہے کہ عبید اللہ بن عمرؒ کہا کرتے تھے:

''میں نے فقہاء مدینہ کو دیکھا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کے معاملے کو بہت بڑا سمجھتے تھے۔ یہ فقہا سالم بن عبداللہؒ[37] سم بن محمد، سعید بن مسیّبؒ اور نافع دیلمی ہیں۔''[38]

⑧ امام ابو عبیدؒ روایت کرتے ہیں کہ ہشام بن عروہ کہا کرتے تھے: ''میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ میرے والد، کتاب اللہ کی کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوں۔''[39]

⑨ محمد بن سیرینؒ کا بیان ہے کہ میں نے عبیدہؒ سلمانی سے ایک آیتِ قرآنی کے بارے میں دریافت کیا، تو کہنے لگے: ''وہ لوگ چلے گئے، جو جانتے تھے کہ قرآن کس بارے میں نازل ہوا ہے، تمہارے لئے یہ کافی ہے کہ خدا سے ڈرو، اور سیدھی راہ چلتے رہو!''

⑩ امام ابو عبیدؒ نے اپنی سند سے مسلم بن یسارؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''جب تم اللہ کے کلام میں گفتگو کرنے لگو تو ٹھہر کر دیکھو کہ اس کے آگے کیا ہے اور پیچھے کیا ہے۔''

⑪ ابراہیمؒ کہتے ہیں: ''ہمارے اساتذہ، تفسیر کرنے سے بچتے اور ڈرتے تھے۔''

⑫ شعبیؒ کہا کرتے تھے: ''بخدا کوئی آیت ایسی نہیں، جس کے بارے میں دریافت نہ کر

چکا ہوں، لیکن تفسیر؛ یہ تو خدا کی طرف سے روایت ہے۔"

⑭ یہی بات مسروق فرمایا کرتے تھے:

"تفسیر کرنے سے بچو اور ڈرو، کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے روایت ہے۔"

یہ اور ایسے ہی دیگر آثارِ صحیحہ کا مطلب یہ ہے کہ سلف صالحین بغیر علم کے تفسیر میں دخل نہیں دیتے تھے، لیکن جس شخص کو شریعت اور لغت کے اعتبار سے علم حاصل ہو، اس کے لئے تفسیر کرنے میں مضائقہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہی سلف سے تفسیریں بھی روایت ہوئی ہیں اور ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ بولتے تھے جب جانتے تھے، اور جس کا علم نہیں ہوتا تھا، اس پر سکوت اختیار کر لیتے تھے اور یہی سب پر واجب بھی ہے لیکن جس طرح بے علمی کی حالت میں سکوت واجب ہے، اسی طرح علم کی صورت میں سوال ہونے پر جواب دینا بھی واجب ہے، کیونکہ خدا فرماتا ہے:

﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ (آل عمران:۱۸۷)

"لوگوں کے لئے ضروری ہے، ظاہر کریں (قرآن کو) اور اسے چھپائیں نہیں۔"

کیونکہ متعدد طرق سے مروی حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

"جس شخص سے علم کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، اور وہ علم کو چھپا جاتا ہے، قیامت کے دن اس کے منہ میں آتشیں لگام دی جائے گی۔"[۴۰]

ابن جریرؒ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا:

"تفسیر چار طرح پر ہے، وہ تفسیر جسے عرب اپنی لغت کی راہ سے جانتے ہیں۔ وہ تفسیر، جس سے جہل کسی کو معاف نہیں۔ وہ تفسیر، جس کا علم علما کو ہے، اور وہ تفسیر جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"[۴۱]

والله سبحانه و تعالى أعلم

---

☆ یہ مضمون شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب 'مقدمہ تفسیر' کی فصل نمبر ۶ اور ۷ پر مبنی ہے جس میں بعض جگہ اختصار اور الفاظ کا معمولی ردّ و بدل بھی کیا گیا ہے۔ (مرتب)

# حـــوالــــــه جـــات

① الرسالہ از حضرت امام شافعیؒ ص ۹۲، طبع احمد شاکر

② یہ روایت مشکوٰۃ کتاب الاعتصام میں بحوالہ سنن ابوداؤد، دارمی اور مسند احمد وغیرہ ہے۔ تنقیح الرواۃ میں علمائے حدیث سے منقول ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

③ حضرت معاذؓ کی یہ حدیث سنن ابی داؤداور جامع ترمذی وغیرہ کے کتاب القضاء میں ہے۔ تفصیلی بحث کیلئے دیکھئے: تلخیص الحبیر ص ۴۰۱، عون المعبود: ج ۳/ص ۳۳۱، تحفۃ الاحوذی: ج ۳، ص ۲۷۶

④ تفسیر ابن جریر: ج ۱/ص ۳۵

⑤ سلیمان بن مہران الاعمش الکوفی

⑥ ایضاً تفسیر ابن جریر

⑦ مسند امام احمد طبع احمد شاکر: ج ۵/ص ۱۵

⑧ تفسیر ابن جریر: ج ۱/ص ۴۰

⑨ ابووائل عبداللہ بن بجیر واعظ۔ (تہذیب: ج ۵/۱۵۳)

⑩ تفسیر ابن جریر: ج ۱/ص ۳۶

⑪ سدی کبیر لقب ہے، اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن کوفی محدثین کے ہاں ان کا پایہ بلند نہیں ہے، اگرچہ بالکل ساقط بھی نہیں، وفات ۱۲۷ھ (تہذیب) لیکن سدی صغیر (محمد بن مروان) ساقط الاعتبار ہے۔ (تہذیب)

⑫ مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری

⑬ تفسیر ابن جریر: ج ۱/ص ۴۰

⑭ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں تشریح الفاظ بھی ساتھ ہوں گے۔

⑮ عبداللہ بن عبیداللہ بن ابی ملیکہؒ تابعی (تہذیب)

⑯ تفسیر ابن جریر: ج ۱/ص ۴۰

⑰ امام حسن بن ابی الحسن البصری ابوسعید کنیت مشہور شخصیت، وفات ۱۱۰ھ (تہذیب: ج ۲/ص ۲۶۳

⑱ ابوعائشہ مسروق بن الاجدع الکوفی تابعی۔ وفات ۶۳ھ

⑲ ابوالعالیہ رفیع بن مہران بصریؒ کبار تابعین سے تھے۔ وفات ۹۰ھ

⑳ ربیع بن انس کندی تابعی ہیں۔ وفات ۱۳۹ھ

㉑ ابوالقاسم ضحاک بن مزاحم خراسانی تابعی ہیں۔ تفسیر میں زیادہ شہرت تھی۔ وفات ۱۰۵ھ

㉒ حافظ حدیث ابوبسطام شبعہ بن حجاج واسطی بصریؒ۔ وفات ۱۶۰ھ تفصیلات کے لئے تہذیب ج ۴ ص ۳۳۸ تا ۳۴۶

㉓ مشکوٰۃ: کتاب العلم، دوسری فصل

㉔ یعنی ایک سند والی روایت

㉕ مشکوٰۃ ایضاً بروایت حضرت جندبؓ

㉖ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۵

㉗ امام ابوعبیدؒ قاسم بن سلام ہرویؒ۔ تفسیر، حدیث، لغت اور فقہ کے امام، اسلامی اقتصادیات پر آپ کی کتاب 'الاموال ہے جو اپنے موضوع پر بہترین ہے۔ مصر میں طبع ہوچکی ہے۔ وفات ۲۲۳ھ (ابن خلکان: ج ۱ ص ۴۱۹)

㉘ اس مضمون کی روایات تفسیر ابن جریر میں بھی ہیں: ج ۳۰ ص ۵۹، ۶۰ طبع ثانی مصر

㉙ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۸

㉚ نیز تفسیر ابن جریر: ج ۲۹ ص ۲۷ طبع ثانی مصر

㉛ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۸

㉜ امام مالک بن انسؒ۔ مالکی مسلک کے موسس۔ وفات ۱۷۹ھ

㉝ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۷

㉞ ایضاً: ج ۱ ص ۳۸

㉟ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۸

㊱ ایضاً: ص ۳۸

㊲ سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب۔ وفات ۱۰۶ھ (تہذیب: ج ۳ ص ۴۳)

㊳ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۷

㊴ تفسیر ابن جریر: ج ۱ ص ۳۸

㊵ مشکوٰۃ: کتاب العلم، دوسری فصل بحوالہ جامع ترمذی وغیرہ

㊶ تفسیر ابن جریر ص ۳۴ طبع ثانی۔ مصطفیٰ البابی مصر ۱۳۷۳ھ بمطابق ۱۹۵۴ء

مولانا عبدالغفار حسن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف ایک ممتاز عالم دین، ژرف نگاہ محقق، کہنہ مشق بزرگ اُستاد ہیں۔ عمر ۸۷ سال کے لگ بھگ ہے اور آج کل بوجہ ضعفِ پیری کئی عوارض کا شکار ہیں۔ آپ کا تدریسی دورانیہ ۵۰ سال پر محیط ہے جس میں ۱۶ برس مدینہ منورہ میں قائم عالم اسلام کی مایہ ناز اسلامی یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ جامعہ رحمانیہ بنارس مدرسہ کوثر العلوم مالیر کوٹلہ اور جامعہ تعلیمات فیصل آباد میں تدریس بھی شامل ہے۔

آپ کے والد بزرگوار مولانا حافظ عبدالستار حسن عمرپوری، حضرت شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولانا عبدالغفار حسن نے دسمبر ۱۹۳۳ء میں دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) سے درسِ نظامی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ادیب عربی اور ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے شیخ الحدیث مولانا احمداللہ، صاحبِ تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، مولانا عبیداللہ مبارکپوریؒ اور ان کے علاوہ کئی دیگر جلیل القدر اور اساطین علماءِ کرام سے کسبِ فیض کیا۔

موصوف ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۷ء تک تقریباً سولہ سال تک جماعتِ اسلامی کے رکن رہے اور متعدد بار مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ دو مرتبہ بانیٔ جماعت مولانا مودودی کی غیر حاضری میں امارتِ جماعت کی ذمہ داری کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں طریق کار سے اختلاف کی بنا پر جماعت سے الگ ہوگئے۔

۱۹۸۰ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مقرر ہوئے، جس دوران اہم دینی مسائل کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ کی تصنیفی کاوشیں بھی قابل قدر ہیں، مشہور تصانیف میں

(۱) انتخابِ حدیث (۲) عظمتِ حدیث (۳) معیارِ خاتون

(۴) حقیقتِ دعا (۵) دین میں غلو جیسی معرکہ آرا تصانیف شامل ہیں۔

زیر نظر مضمون دراصل آپ کی ایک تقریر سے ترتیب دیا گیا ہے جس میں آپ نے قرآن فہمی کے اُصولوں پر مثالوں کی مدد سے اَحسن انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ تفسیر قرآن پر آپ کے مضامین کا ایک سلسلہ محدث میں بھی جاری رہا ہے، جس میں آپ نے علامہ حافظ ابن قیم کے تفسیری افادات کا اُردو ترجمہ وتفہیم فرمائی ہے۔ (دیکھئے: مئی، جون، جولائی، ستمبر ۲۰۰۱ء نیز شمارہ محدث ۱۱/۲۶، ۲/۲۷)

۲۰۰۱ء میں مولانا صلاح الدین یوسف کی تفسیر 'احسن البیان' پر بھی آپ نے نظر ثانی فرمائی۔ آپ کا علمی مرتبہ مسلم ہے اور آپ کی عالمانہ شخصیت علماءِ اسلام کی آبرو ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے اور آپ کے علم وتجربہ سے اُمت کو زیادہ سے زیادہ فیض یاب فرمائے۔ آمین ! (مرتب)

# قرآن فہمی کے بنیادی اُصول

مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ

﴿ آلرٰ ، كِتٰبٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، اللّٰهِ الَّذِىْ لَهُ مَا فِى السَّمٰوٰاتِ وَمَا فِى الأَرْضِ وَوَيْلٌ لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ، الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُوْلٰئِكَ فِىْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ﴾ (ابراہیم:۱تا۴)

”یہ کتاب ہم نے آپ کی طرف اس لیے اُتاری ہے کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں۔ ان کے ربّ کے حکم سے غالب اور قابل حمداللہ کی راہ کی طرف لائیں۔ وہ اللہ جو آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات کا مالک ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب (کی وجہ) سے تباہی ہے جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں اوراللہ کی راہ سے روکتے ہیں اوراس میں کجی چاہتے ہیں۔ یہی لوگ گمراہی میں دور تک نکل گئے ہیں۔“

آج کل ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کے اِجرا کا چرچا ہے، اس لئے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین یا اسلامی شریعت کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ اصل سرچشمہ اوراہم بنیاد قرآنِ مجید ہے۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ خواہ عوام ہوں، خواہ حکمران، ان کو سب سے پہلے قرآنِ مجید سے تعلق رکھنا چاہئے اوراس کیلئے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے قرآنِ مجید کے بارے میں بتایا جائے کہ اس کا فہم کیسے حاصل ہوتا ہے۔ ہم قرآن مجید کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ وہ کون سے وسائل اور کون سے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ سے قرآن مجید کو صحیح معنی میں سمجھا جائے اوراس کا مقصدِنزول پورا کیا جائے۔

ان آیات میں قرآن کا مقصدِ نزول بیان کیا گیا ہے۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ لیکن نہایت ہی سادہ الفاظ میں فرمایا: ﴿كِتٰبٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ﴾

''اے محمدؐ ہم نے آپؐ کی طرف کتاب اس لئے اُتاری ہے تاکہ آپؐ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں۔''

کتابُ اللہ کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ تاریکیاں بہت سی پھیلی ہوئی ہیں اور قرآن تاریکیوں سے نکالے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت بھی بہت سی تاریکیاں اور اندھیرے تھے: کفر وشرک کے اندھیرے، رسم ورواج کے اندھیرے، شخصیت پرستی، بت پرستی اور زَر پرستی کے اندھیرے۔ نہ معلوم قبائل پرستی اور زبان پرستی کی کتنی تاریکیاں تھیں۔ ان تمام تاریکیوں کو چھانٹنے اور نور کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے قرآنِ مجید کا نزول ہوا۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں 'ظلمات' کو جمع لایا گیا ہے۔ 'ظلمات' جمع ہے ظلمت کی اور اس کے مقابلہ میں حق کو 'نور' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں صرف نور کہا، نور کی جمع اَنوار نہیں کہا۔ 'ظلمات' جمع اور 'نور' واحد ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گمراہیاں اور تاریکیاں بہت سی ہیں، ان کے راستے بھی بہت سے ہیں لیکن نور ایک ہی ہے۔ حق ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے یعنی قرآنِ مجید!!

توحید کو سمجھانے کے لئے یوں بیان کیا گیا ہے کہ انبیاءِ کرامؑ اور رسولِ اکرمؐ کا یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں: ﴿بِإِذْنِ رَبِّهِمْ﴾ یہ ان کے ربّ کے اِذن سے ہے۔ انہیںؐ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اس بنا پر اس دعوت کو رسولِ اکرمؐ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو پیش کیا۔ اور وہ نور کیا ہے؟ وَإِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ کے راستہ کی طرف جو عزیز و غالب ہے جس پر کوئی دوسرا غالب نہیں آسکتا اور جو حمید اور حمد والا ہے یعنی اپنی رحمتوں اور اپنی نعمتوں اور اِنعام و اکرام کی بنا پر حمد کا مستحق ہے۔ اور جس کی حکمرانی تمام کائنات پر ہے اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے قبضہ میں ہے، اسی کے تابع ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ پھر رکاوٹ کیا ہے۔ روشنی سامنے آجائے تو لوگ اس کو کیوں نہیں مانتے، اس کی وجہ کیا ہے؟ تو فرمایا: ﴿وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ کفر

دلوں میں راسخ ہوجاتا ہے اور انسان معاندانہ روش اختیار کرلیتا ہے تو پھر قبولِ حق کے دروازے اس کے لئے بند ہوجاتے ہیں۔ اور یہ کفر انسانوں کے دلوں میں ڈیرے کس طرح ڈالتا ہے؟ اس کی بڑی وجہ یہ ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ﴾ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب حق ان کے مفاد پر چوٹ لگائے گا اور ان کے فائدوں پر زَد پڑے گی تو ظاہر بات ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

دعوتِ حق اور دعوتِ قرآن قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسے آخرت کے مقابلہ میں پسند رکھتے ہیں اور اسی بنا پر ﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ صرف خود نہیں رکتے بلکہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس دعوتِ حق کو بھی۔

قرآنِ مجید کی دعوت کو بدنام کرنے کے لئے ان کا ایک رویہ یہ بھی ہے: وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کہ اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، کجی پائی نہیں جاتی بلکہ تلاش کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی مل جائے جس سے لوگ مغالطہ میں پڑ جائیں اور قرآنِ مجید کی دعوت سے لوگ مستفید نہ ہوسکیں، فرمایا: اُولٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ یہی لوگ گہری گمراہی میں ہیں۔

یہاں تک ان آیات کی تفسیر ہے جن میں قرآنِ مجید کا مقصدِ نزول بیان کیا گیا ہے۔

## قرآن مجید کے مقاصدِ نزول

① **ترتیل قران**: قرآنِ مجید کا مقصدِ نزول کیسے حاصل ہوسکتا ہے، اس کے لئے خود قرآنِ مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے انسان قرآنِ مجید پر ایمان لائے، اس کی عظمت کا قائل ہو اور اس کو بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھے جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھئے۔'' اسی طرح سورۃ الاسراء میں فرمایا:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾

''ہم نے اس قرآنِ مجید کو اتارا ہے تاکہ آپ ؐ اسے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھیں۔''

تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکلنے کے لئے پہلا زینہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کو بڑے اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھا جائے ،اس کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اس سے ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

② **فہم قران**: دوسرا زینہ یہ ہے کہ محض قرآنِ مجید کا پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں رواج ہے یا بلادِ عجم میں دیگر مقامات پر بھی یہ رواج ہے بلکہ اب تو عربوں میں بھی یہ مصیبت آ گئی ہے کہ قرآنِ مجید پڑھتے ہیں، سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو عرب ہو اور عربی جانتا ہو، وہ قرآنِ مجید سمجھ بھی جائے۔ بلاتشبیہ عرض ہے کہ جس طرح بہت سے لوگ بانگِ درا یا غالب کا دیوان پڑھے ہوئے ہیں، یہ اُردو میں ہیں، لیکن ہر اردو دان اس کو نہیں سمجھتا، سمجھنے کیلئے تو کاوش کی ضرورت ہے۔

عربوں کے اندر بھی اب یہ رواج ہے کہ وہ بس تبرکاً پڑھ لیتے ہیں۔ یہ تبرک کا فلسفہ جسے نظریہ کہئے یا خیال ، اس نے بھی ہمیں قرآن مجید سے بہت دور ڈال دیا ہے اور میں مضمون کے آخر میں 'موانع فہم قرآن' کے سلسلہ میں بھی کچھ عرض کروں گا۔ اس موقع پر تفصیل سے بتاؤں گا کہ کون کون سی رکاوٹیں ہیں جنہوں نے ہمیں قرآنِ مجید سے دور کر دیا ہے۔ جب تک یہ رکاوٹیں نہیں ہٹیں گی، اس وقت تک ہم قرآنِ مجید سے قریب نہیں ہو سکتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا زینہ ہے کہ قرآنِ مجید کو سمجھ کر پڑھا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كِتٰبٌ أَنْزَلْنٰهُ إِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ أُوْلُوْا الْأَلْبَابِ﴾(سورۂ ص:۲۹)

''ہم نے برکت والی کتاب اُتاری ہے تاکہ اس کی آیات میں تدبر کر لیا جائے اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔''

یعنی تبرک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی اس کو محض چوم اور چاٹ لے جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ چوما چاٹی ہی تبرک کی نشانی سمجھی جاتی ہے اور اس سے گویا ان کے خیال میں قرآنِ مجید کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

③ **عمل بالقران**: قرآنِ مجید کو جب آپ نے سمجھ لیا تو پھر تیسرا زینہ 'عمل بالقرآن' ہے کہ قرآنِ مجید پر عمل کیا جائے جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ

بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ﴾یعنی ہم نے اس کتاب کو اتارا ہے تا کہ آپؐ ان کے درمیان فیصلے کریں۔ ان کے جھگڑوں کو چکائیں اور یہ لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآنِ مجید کے احکام کو جاری کریں اور قرآن نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے، ان کو حلال سمجھیں اور جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، انہیں حرام سمجھیں۔

یاد رہے کہ قرآن مجید کو محض سمجھنا بھی کافی نہیں ہے جیسا کہ آج کل بہت سے مستشرقین ہیں جنہوں نے قرآنِ مجید کی بظاہر بڑی خدمت کی اور بہت سے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ صرف تحقیق برائے تحقیق ہے۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اس پر عمل کریں گے یا وہ سب کے سب قرآنِ مجید کی عظمت کے قائل ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ بعض قائل ہوں لیکن ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کا مقصد محض تحقیق کرنا ہے جس طرح وہ علومِ شرقیہ کی دوسری کتابوں کی تحقیق کرتے ہیں، اسی طرح قرآنِ مجید کی بھی تحقیق کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دل و جان سے قرآن مجید کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ غرض تیسرا زینہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ اپنے اوپر، اپنے گھر والوں پر، اپنی برادری پر، اپنے کنبہ پر اور اگر اللہ تعالیٰ اختیارات دے تو پورے ملک پر۔ یعنی جس قدر بھی ممکن ہو سکے، قرآنِ مجید کی تعلیم کو پھیلایا اور نافذ کیا جائے۔

اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ آپ جب اس کو اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پر جاری و نافذ کرتے ہیں تو یہ نعمت آپ کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اسکو پھیلایا جائے، فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾(سورۃ النحل:۴۴)

”جو ہم نے آپ پر ذکر نازل کیا ہے، اس کو لوگوں میں آپؐ پھیلا یئے۔“

جب تک کہ یہ سارے سلسلے اور سارے زینے ہم نہ اپنائیں گے، اس وقت تک تاریکیوں سے نور کی طرف نہیں آ سکتے۔ اگر قرآنِ مجید کو صرف تبرک بنا کر رکھ لیں تو اس سے فہم حاصل نہیں ہوسکتا۔

## فہم قرآن کا پہلا ذریعہ......قرآن کی تفسیر قرآن کے ذریعے

قرآنِ مجید کو کس طرح سمجھا جائے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے۔قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خود قرآنِ مجید ہی سے اس کو سمجھا جائے: القران یفسّر بعضه بعضًا قرآن کا کچھ حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ اگر ایک جگہ پر اِجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل ہے۔ اگر ایک جگہ آپ سمجھتے ہیں کہ بات ذہن میں واضح نہیں ہو رہی ہے تو قرآن میں اسے دوسری جگہ کھول دیا گیا ہے۔

**پہلی مثال** :قرآنِ مجید میں آتا ہے: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّآلِّيْنَ﴾

''دکھا ہمیں سیدھی راہ، راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔''

اب یہ کون لوگ ہیں جن پر انعام کیا گیا ہے؟ سورۃ البقرہ میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا بیان آیا ہے، سورۃ آلِ عمران میں ضَآلِّيْنَ کا۔ اور اس کے بعد سورۃ النساء میں ہے کہ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے کون لوگ مراد ہیں، ارشاد فرمایا: ﴿أُوْلٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ أُوْلٰئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء: ٦٩)
یعنی انبیاء کرامؑ کی جماعت، صدیقین کی جماعت، شہداء کی جماعت جنہوں نے اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کیں اور اس طرح اپنے ایمان کی شہادت دی اور صالحین، اللہ کے نیک بندے جو حلال وحرام میں تمیز کرتے ہیں اور اللہ کے دین کو قائم رکھتے ہیں۔ یہ اس اجمال کی تفسیر ہوگئی جو سورہ فاتحہ میں ہے۔

اسی طرح سورۂ بقرہ میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کے ضمن میں یہود کا ذکر آتا ہے اور سورۂ آل عمران میں نصاریٰ کا ذکر آتا ہے، یہ ضَآلِّيْن ہیں۔ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْن فرق ہے: مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ قوم ہے جو معاندانہ روش اختیار کرتی ہے، جانتے بوجھتے حق سے کتراتی ہے، علم رکھتے ہوئے حق کو جھٹلاتی ہے۔ یہود اس میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ حق کیا ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهُ كَمَا يَعْرِفُوْنَ أَبْنَاءَ هُمْ﴾ وہ رسول اکرمؐ کو پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے''۔ جس طرح انہیں اپنے بیٹوں کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہماری اولاد ہے، اسی طرح رسول اکرمؐ کو پہچانتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول

ہیں۔ اس معرفت اور علم کے باوجود انہوں نے انکار کیا۔ یہ یہود تھے جنہوں نے عناد اور سرکشی کی راہ اختیار کی۔ ضالین وہ ہیں جو بغیر علم کے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، علم ہی حاصل نہیں کیا۔ نصاریٰ میں یہ وصف نمایاں ہے۔ ان میں معاندین بھی ہوں گے لیکن زیادہ وہ ہیں جنہوں نے علم کے بغیر گمراہی کی راہ اختیار کی۔ اسی لئے نصاریٰ میں بدعات زیادہ پیدا ہوئیں۔

**بدعت اور بغاوت میں فرق:** بدعات زیادہ وہاں پیدا ہوتی ہیں جہاں جہالت زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں سرکشی اور عناد ہے وہاں بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ بغاوت اور بدعت میں فرق ہے۔ بغاوت کے معنی ہیں: دین سے نفرت اور بدعت وہ ہے جہاں بدعتی دین سے محبت رکھتا ہے، اتنی زیادہ محبت رکھتا ہے کہ پھر وہ دین کے معاملہ میں غلو کر جاتا ہے۔ اور اپنی طرف سے کچھ ایسے طریقے ایجاد کرتا ہے جن سے وہ چاہتا ہے کہ وہ اور آگے بڑھ جائے۔ اسی لئے قرآنِ مجید میں فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَاكَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلاَّ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ رہبانیت یعنی ترکِ دنیا کا طریقہ نصاریٰ نے اختیار کیا تھا، انہوں نے خود اس کو ایجاد کیا ہے۔ یہ بدعت ان کی طرف سے ہے۔ ہم نے یہ طریقہ ان پر لازم نہیں کیا تھا، یہ ان کی اپنی ایجاد ہے۔ تو یہ فرق ہے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور ضَآلِّيْنَ میں۔ اور ان دونوں کی تفسیر سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران میں آ گئی۔

**دوسری مثال:** اسی طرح قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (سورۃ الحجر: ۹۹) ''اور اپنے ربّ کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین آ جائے''۔ اب یہاں بعض لوگوں کو مغالطہ ہو گیا کہ 'یقین' اپنے مشہور مفہوم میں مستعمل ہے۔ جب 'یقین' کامل ہو گیا تو نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہمیں پتہ چلا کہ ناظم آباد میں کوئی پیر صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ ''عبادت ہم نے کر لی اور عبادت کر کے اب ایسے مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں کہ اس کے بعد اب نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص فوج کا سالارِ اعلیٰ بن جائے تو وہ پریڈ نہیں کرتا، پریڈ تو نیچے کے لوگ سپاہی وغیرہ کرتے ہیں، سالارِ اعظم یا کمانڈر انچیف تو پریڈ نہیں کرتا۔ وہ تو اس سے بالاتر ہو گیا۔ اسی طرح جب یقین آ گیا ہے تو عبادت کے تم مکلّف نہیں رہے ہو۔''

یہ کتنا گمراہ کن عقیدہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسی زندگی میں غیر مکلّف ہوگیا۔ اور اس نے عبادت کی زحمت سے اپنے آپ کو بچا لیا کیونکہ اسے وہ زحمت سمجھتا ہے حالانکہ رسول اکرمؐ کا یہ حال تھا کہ آپ عبادت کرتے تھے: «حتیٰ تورّمت قدماہ» یہاں تک کہ آپؐ کے قدمِ مبارک پر ورم آ جاتا تھا۔ رات کو دیر دیر تک تہجد کی عبادت کرتے تھے، لمبے لمبے قیام کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے ایک بار کہا: آپؐ کا اتنا بڑا درجہ ہے، آپؐ بخشے بخشائے ہیں، آپؐ اتنی محنت کیوں کرتے اور اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں تو فرمایا: «أفلا أکون عبداً شکوراً» ''کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں''، مجھ پر اللہ تعالیٰ نے اتنے انعامات اور احسانات کیئے ہیں، کیا میں ان کا شکریہ اَدا نہ کروں؟ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مراتب کے لحاظ سے جو جتنا اونچا ہوتا ہے، اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا ہے۔ عبادت میں اتنا ہی اس کا ذوق بڑھ جاتا ہے۔ اور جو جتنا اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے، اسی قدر شیطان کے پھندے میں پھنس کر اللہ تعالیٰ کی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں 'یقین' کے معنی ایک اور جگہ بھی آئے ہیں۔ سورۃ المدثر میں آتا ہے کہ جب جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے اور جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو جنتی جہنمیوں سے سوال کریں گے: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرٍ﴾ تمہیں جہنم میں کس چیز نے دھکیل دیا، تم نے کیا کرتوت کیئے تھے کہ جن کی بنا پر تم جہنم میں گئے: ﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ، وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ، وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ حَتّٰٓى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ﴾ (سورۃ المدثر: ۴۲۔۴۷) انہوں نے کہا کہ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ نمازیوں میں ہمارا شمار نہیں تھا کیونکہ نماز ادا نہیں کرتے تھے اور غریبوں و مسکینوں کو ہم کھانا بھی نہیں کھلاتے تھے، ان کی مدد بھی نہیں کرتے تھے اور گپ شپ کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول ہو جاتے تھے اور ہم الدین یعنی یومِ جزا کے منکر تھے۔ اور ہمارا یہ سلسلہ جاری رہا حتی اتٰنا الیقین یہاں تک کہ ہمیں 'یقین' نے آلیا۔ یہاں یقین کے معنی 'موت' کے ہیں۔ یعنی آخری سانس تک ہمارا یہی عمل رہا۔

معلوم ہوا کہ ہمارے پیشِ نظر آیت میں 'یقین' کے جو مشہور معنی ہیں وہ تو نہیں لیے جاسکتے

جبکہ قرآن مجید کی اصطلاح میں 'یقین' کے معنی موت کے بھی آتے ہیں کیونکہ موت سے زیادہ یقینی چیز اور کوئی نہیں۔ بہت بڑا وصف موت کا یقین ہے۔ ہم روزانہ دیکھتے ہیں، آج اس کو کاندھا دے رہے ہیں، آج اس کے ہاں تعزیت کے لئے جارہے ہیں، آج وہاں سے خبر آئی ہے کہ فلاں کا انتقال ہوگیا ہے۔ آخر یہ کیا ہے؟ کوئی کتنا ہی عقل کا اندھا ہو، بے شعور ہو لیکن یہ چیز ایسی ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنے ربّ کی آخری سانس تک عبادت کر یہاں تک کہ تجھے موت آجائے۔ تو قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ آگئی۔

**تیسری مثال:** ایک جگہ قرآن مجید میں آتا ہے ﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ تمہیں تکاثر نے غافل کردیا۔ یعنی کثرت میں مقابلہ آرائی نے۔ اب یہ تکاثر کیا ہے؟ کس چیز میں تکاثر؟ قرآن مجید نے اس بات کو یہاں نہیں چھیڑا۔ البتہ سورۂ حدید میں فرمایا: ﴿إِعْلَمُوْا أَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الأَمْوَالِ وَالأَوْلَادِ﴾

''خوب جان رکھو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشا، زینت اور آپس میں فخر وغرور اور مال واولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے آپ کو زیادہ بتلانا ہے۔'' (الحدید:۲۰)

وہاں اسکو کھول دیا کہ 'تکاثر' زیادہ تر مال میں اور اولاد میں ہوتا ہے۔ مقابلہ آرائی اور فخر اس چیز میں ہوتا ہے کہ ہمارا جتھا بڑا ہے، ہمارے پاس غنڈے، بدمعاش اور لڑنیوالے زیادہ ہیں۔

جیسا کہ سورۃ الکھف میں فرمایا: ﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالاً وَّأَعَزُّ نَفَرًا﴾ (کہف:۳۴) سورۃ الکھف میں ایک کافر اور ایک مؤمن کا مکالمہ درج کیا گیا ہے۔ وہاں کافر کہتا ہے کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور میری جمعیت اور میرا جتھا بڑا قوی ہے۔

اسی طرح قرآن میں ایک جگہ اجمال ہے اور اس کی تفسیر دوسری جگہ ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا وقت نہیں، صرف چند اشارات کردیئے ہیں۔ جس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی نہیں کہ آپ کہیں سے کوئی ایک آیت لے لیں اور یہ سمجھیں کہ بس ہم نے قرآن مجید کو سمجھ لیا ہے بلکہ قرآنِ مجید کو سمجھنے کے لئے پورے قرآن مجید پر نگاہ ڈالی جاتی ہے اور ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ مل جاتی ہے۔

## فہم قرآن کا دوسرا ذریعہ...... سیاق وسباق☆

قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے دوسرا ذریعہ اس کا سیاق وسباق ہے۔ قرآن مجید کے آگے پیچھے کی عبارت اور آیات سے بھی مطلب حل ہوجاتا ہے۔ اگر درمیان سے آپ نے کوئی ایک آیت لے لی اور نہ سیاق دیکھا نہ سباق۔ سباق کے معنی ہیں کہ پہلی آیات میں کیا ہے اور سیاق کا معنی ہے کہ بعد کی آیات میں کیا ہے۔ سیاق وسباق سے بے پرواہ ہوکر اگر آپ قرآن مجید میں غور کرتے ہیں تو اس سے قرآن مجید کا اصل مفہوم آپ کو نہیں مل سکے گا اور فہم قرآن میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے بلکہ مغالطہ ہوسکتا ہے مثلاً: ﴿اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۵۱) فرمایا: ”کیا ان کو کافی نہیں ہے کہ ہم نے ان پر کتاب اُتاری ہے جس میں مؤمنوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے۔“

اب اس آیت کو ان لوگوں نے مغالطہ دینے کے لئے چن لیا ہے جو حدیث کو حجت نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے اس آیت کی رو سے قرآن کافی ہے۔ حدیث اور سنت کی کیا ضرورت ہے؟ ان مغالطوں کی باقاعدہ کتابوں اور رسالوں میں اشاعت ہورہی ہے اور ان نوجوانوں کو جو قرآن مجید کو نہیں سمجھتے یا ان کا قرآن مجید سے تعلق نہیں رہا ہے، مغالطہ میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ اور ان کے ذہن میں یہ بٹھانے کی کوشش ہورہی ہے کہ حدیث وسنت کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، قرآن خود کہہ رہا ہے کہ ہمارے لئے تو بس قرآن کافی ہے۔ لیکن آپ اگر یہ دیکھیں کہ اس کا سیاق وسباق کیا ہے، اس سے پہلے کیا ہے، کس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے تو سمجھنے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے یہ آتا ہے ﴿وَقَالُوْا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَبِّهٖ﴾اس نبی پر ربّ کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں؟ ان کا مطالبہ معجزوں کے لئے تھا جس طرح حضرت موسیٰؑ کو معجزہ دیا گیا تھا کہ سمندر پھٹ گیا اور

☆ جمہور مفسرین اور ائمہ سلف کے ہاں فہم وتفسیر قرآن کا دوسرا ذریعہ 'تفسیر القرآن بالحدیث' اور تیسرا ذریعہ 'اقوالِ صحابہؓ' ہے۔ مگر موصوف نے 'تفسیر القرآن بالحدیث' کو چوتھا اور 'اقوالِ صحابہؓ' کو پانچواں ذریعہ قرار دیا ہے۔ فاضل مضمون نگار کی اس نئی ترتیب پر آئندہ مستقل مضمون میں بحث ونقد کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: 'قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا کردار' از ڈاکٹر محمد امین (کتاب ہذا کا صفحہ نمبر ۱۱۳) مرتب

قافلہ گذر گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو معجزات دیئے گئے تھے جنہیں لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح کوڑھیوں کو اچھا کرتے ہیں، اندھوں کو بینا بناتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کے معجزات اور اس طرح کی نشانیاں رسولِ اکرمؐ کو کیوں نہیں دی گئیں۔ تو یہ تھا ان کا سوال ان آیات کو پھر پڑھئے:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ ايٰتٌ مِّنْ رَبِّهٖ قُلْ إِنَّمَا الاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ، اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۵۰،۵۱)

''نیز کہتے ہیں کہ اس پر اس کے ربّ کی طرف سے معجزے کیوں نہ نازل ہوئے آپ کہیے کہ معجزے اللہ کے پاس ہیں اور میں تو واضح ڈرانے والا ہوں۔ کیا انہیں کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لئے یقیناً رحمت اور نصیحت ہے۔''

یہ زندہ معجزہ ہے جو قیامت تک کے لئے ہے۔ آخر اس معجزہ کے ہوتے ہوئے پھر وہ کہتے ہیں کہ ایسے معجزے دکھاؤ جیسے کہ دوسرے انبیاء کرامؑ نے دکھائے۔ یہاں وہ بات بنتی نہیں ہے جو منکرین حدیث بنانا چاہتے ہیں۔ یہاں نہ حدیث کے ردّ کا سوال ہے، نہ اس کے عدمِ حجیت کا معاملہ ہے۔ یہاں جو ان کا اصل سوال اور مقصد تھا کہ محسوس معجزات دکھاؤ، تو اس کا ردّ کیا گیا ہے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا سیاق و سباق بھی ہمارے سامنے رہے۔ لیکن اگر وہ سامنے نہیں رہتا تو ایسی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ ہم غلط راستے پر چلے جائیں۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں لیکن اس وقت میں اسی مثال پر اکتفا کروں گا۔

## قرآن فہمی کا تیسرا ذریعہ.....تعامل اُمت

قرآن فہمی کے لئے تیسرا ذریعہ تعامل اُمت ہے۔ یعنی پوری امت کا جو تعامل چلا آ رہا ہے وہ بھی قرآن مجید کے فہم میں معاون ہے۔ اگر تعامل اُمت کو آپ نظر انداز کر دیں تو پھر ایسی صورت میں قرآن مجید کا فہم حاصل نہیں ہوسکتا۔ تعامل سے مراد ہے عہدِ نبویؐ سے لے کر

صحابہؓ کے دور میں، تابعین کے دور میں، محدثین اور فقہا کے دور میں اس پر کیسے عمل کیا گیا؟ مفسرین کے دور سے لے کر اب تک جو بات لوگوں میں دین کے نام سے رائج چلی آ رہی ہے، وہ قرآن کے لئے بہترین تفسیر ہے۔ یہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری سے لے کر اب تک جو رسم و رواج اور بدعات رائج ہو گئیں، ان کو ہم تعامل امت کہہ دیں۔[①] وہ تعامل اُمت نہیں کہلائی جا سکتیں۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے ﴿أَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ﴾ نماز قائم کرو۔ اب یہ نماز کس طرح قائم کریں، کتنی رکعات ظہر کی ہیں اور کتنی عصر کی۔ یہ تعامل ہے، یہ تواتر ہے جس کا انکار ایسے ہی ہے جیسے قرآن مجید کا انکار۔ جس طرح قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے، اسی طرح نماز کی رکعات بھی۔ ایک مرتبہ میں یہی مضمون بیان کر رہا تھا کہ میری زبان سے غلطی سے عصر کی تین رکعتیں نکل گئیں؛ فوراً آوازیں آئیں، چار رکعتیں، چار رکعتیں۔ میں نے کہا کہ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ کتنا مشہور مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ہم آہستہ آہستہ سنت سے بیگانہ ہو کر بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان، نماز کی رکعات کی تعداد تعامل اُمت سے ثابت ہیں۔

پانچ کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے۔ لیکن تمام اُمت کا تعامل ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہے۔ ہاں منکرین حدیث میں سے بعض نے کہا تین وقت، کسی نے کہا دو وقت، کسی نے کہا ایک وقت، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، یہ الگ مضمون ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تعامل کا جو

---

① تفسیر قرآن کے مآخذ کے بارے میں تعامل اُمت اور حدیث وسنت کی درجہ وار اہمیت کے حوالہ سے مولانا صاحب کا اُسلوب چونکہ مولانا اصلاحیؒ کے مشابہ ہے جس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں کیونکہ مولانا اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن جماعتِ اسلامی کے اندر اور اس سے علیحدہ ایک عرصہ ہم سفر رہے ہیں۔ طبعاً میلانِ فکر کی یکسانیت پر طویل ہم سفری بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ تاہم مولانا موصوف بعد میں مولانا اصلاحی صاحب کے استخفافِ حدیث کے رویہ پر خاموش نہ رہ سکے اور مسئلہ رجم وغیرہ کے سلسلہ میں برملا اختلاف کیا بلکہ تعامل اُمت اور حدیث وسنت کے بارے میں غور سے دیکھا جائے تو مولانا موصوف اصلاحی صاحب کے ساتھ پوری طرح ہم نوا نہیں ہیں یعنی مولانا اصلاحی تو نہ صرف تعامل اُمت پر ہی اکتفا کرتے ہیں بلکہ اسے سنت متواترہ قرار دیتے ہیں جب کہ مولانا موصوف تعامل اُمت کو صرف اخبار واحادیث کی تمہیدی حالت سمجھتے ہیں لہٰذا تعامل امت اور بدعات کے فرق کے لیے اخبار واحادیث کو ہی معیار مانتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر وعظ وارشاد کے میدان میں سنت وبدعت کے امتیاز کے قائل ہیں۔ دیکھئے صفحہ نمبر ۱۳۸ (مرتب)

انکار کرتا ہے وہ قرآن مجید کا منکر ہے۔'تعامل' حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ امت کے تعامل سے احادیث کے مضمون کی تائید ہو جاتی ہے، اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کے فہم کا یہ تیسرا ذریعہ ہے۔ ورنہ آپ حج کیسے کریں گے؟ حج نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کیا ہے، صحابہ کرامؓ نے کیا ہے، جزئیات میں اختلاف ہے لیکن جو بنیادی اور اہم چیزیں ہیں مثلاً طواف، سعی، اِحرام ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

## فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ......اخبارِ آحاد

اس کے بعد فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ ہے: اخبارِ آحاد یعنی وہ احادیث جن کا درجہ تواتر کا نہیں ہے لیکن وہ صحیح روایات ہیں۔ ثقہ راویوں سے وہ روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات کی بنیاد پر ہم یہ کہیں گے کہ اگر قرآن مجید کی کسی آیت کا مطلب ہم سمجھنا چاہتے ہیں جو سیاق وسباق، کسی دوسری آیت یا تعامل امت سے ہم نہیں سمجھ سکے تو پھر ہم نبی اکرمؐ کی ثابت شدہ سنت کی طرف رجوع کریں گے۔ ثقہ راویوں سے جو چیز ہمیں حاصل ہوئی ہو، اس کی مدد سے ہم قرآن مجید کو سمجھیں گے۔

**پہلی مثال:** قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ﴾ (التوبہ:۳۴)

''جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو''۔

صحابہ کرامؓ تو اہل زبان تھے۔ جب انہوں نے یہ آیت سنی تو پریشان ہو گئے۔ کنز کے معنی جمع کرنے کے ہیں خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ۔ انہوں نے کہا: أینا لم یکنز ہم میں سے کون ہے جس کے پاس کنز نہیں ہے، تھوڑا بہت سونا چاندی تو تقریباً سب کے پاس ہے۔ اب کیا عذاب جہنم کی سب کے لئے بشارت ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں رسول اکرمؐ کی خدمت میں جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ ابوداود کی روایت ہے کہ آپؐ

نے فرمایا: «ماأدى منه زكوٰة فليس بكنز» ''جس مال میں سے زکوٰۃ نکال دی جائے، [شریعت کے مطابق غریبوں کا حق دیا جائے]، وہ کنز نہیں رہتا۔''

یہاں اگر آپ لغت کے لحاظ سے دیکھیں گے تو کنز بن جاتا ہے خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ۔ لیکن رسول اکرمؐ نے اس کی تشریح کردی اور ایک دوسری حدیث میں آتا ہے، آپؐ نے فرمایا: «إن الله لم يفرض الزكوٰة إلا ليطيب ما بقى من أموالكم» ''اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باقی ماندہ مال کو پاک کردے''۔ زکوٰۃ نکالنے کے بعد جو مال بچے گا وہ مال پاک ہوگا۔

## کیا قرآنِ مجید اپنا مفہوم بیان کرنے میں حدیث کا محتاج ہے؟

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سنت اور حدیث کے محتاج ہیں۔ منکرین حدیث یہ کہہ دیتے ہیں کہ کیا قرآن ناقص ہے؟ کیا قرآن ادھورا ہے جو ہم سنت کو مانیں؟ کیا ہمارے لئے قرآن کافی نہیں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید تو اپنے مطالب میں ناقص اور ادھورا نہیں ہے لیکن ہم اس کو سمجھنے کے لئے سنت کے محتاج ہیں جس طرح کہ ہم عربی زبان کے محتاج ہیں۔ کیا کوئی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر عربی زبان جانے وہ قرآن مجید سمجھ جائیں گے؟ قرآن مجید عربی زبان میں ہے تو عربی زبان بھی سمجھیں۔ اسکے معنی یہ نہیں کہ چونکہ آپ عربی زبان کے محتاج ہیں، اس لئے قرآن مجید ناقص ہے۔ قرآن مجید محتاج نہیں بلکہ ہم عربی زبان کے محتاج ہیں۔ اس طرح ہم محتاج ہیں رسول اکرمؐ کی تشریح وتفسیر کے، کہ جس ہستیؐ پر قرآن مجید نازل ہوا تھا، اس ہستیؐ نے اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا؟ اگر ہم اس سے بے نیاز ہوجاتے ہیں اور اپنی طرف سے مطلب بیان کرتے ہیں تو حقیقت میں ہم سیدھے راستے سے بھٹک رہے ہیں اور قرآن مجید کا جو اصل مقصد ہے کہ ﴿لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ﴾ بجائے ظلمات سے نکلنے کے ہم ظلمات ہی میں ڈوبے رہیں گے کہ ایک تاریکی سے نکلیں گے، دوسری تاریکی میں چلے جائیں گے۔

**دوسری مثال:** اسی طرح قرآنِ مجید میں آتا ہے: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (النساء:۱۱) یہاں پر کوئی تفصیل نہیں کہ کیسی اولاد ہو۔ لیکن حدیث سے

معلوم ہوتا ہے «لا یرث القاتل» کہ بیٹے نے اگر باپ کو قتل کر دیا تو وہ وارث نہیں ہوگا۔ مزید برآں حدیث نے یہ مفہوم بیان کر دیا کہ اختلافِ دین ہونے کی بنا پر یا قاتل ہونے کی بنا پر وہ اپنے باپ کا وارث نہیں ہوسکتا۔

**تیسری مثال:** قرآن مجید میں آتا ہے لیکن قرآن میں صرف اشارہ ہے اور حدیث میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں۔ قرآن مجید میں محرماتِ ابدیہ کا بیان ہوا ہے کہ نکاح کے لئے مائیں حرام ہیں، بیٹیاں حرام ہیں اور بہنیں حرام ہیں۔ لمبی آیت ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ ان کے علاوہ تمہارے لئے دیگر عورتیں حلال ہیں لیکن رسول اکرمؐ نے فرمایا: (آپؐ کا اجتہاد بھی وحی کی روشنی میں تھا) کہ «لا یجمع بین المرأة وعمتها وبین المرأة وخالتها» کہ پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں رکھنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن قرآن مجید میں یہ ذکر ہے کہ أَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الأُخْتَيْنِ ''دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے۔''

اس کی وجہ کیا ہے کہ جب دو سگی بہنیں سوکنیں بن جائیں گی تو سوکن کے رشتہ میں ایک قسم کی رقابت اور عداوت ہوتی ہے۔ اور بہنیں ہونے کا رشتہ یہ چاہتا ہے کہ دونوں میں محبت ہو۔ گویا اس طرح سے دونوں میں قطع تعلق ہو جائے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں ہے، ابن حبان کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: «إذا فعلتم ذلك قطعتم أرحامكم» کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم اپنے رشتوں کو کاٹ ڈالو گے۔ دو بہنوں میں محبت ہوتی ہے، وہ نہیں رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی ان کا قریبی رشتہ ہے، دونوں میں محبت ہے جو فطری چیز ہے۔ اب اگر دونوں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں ہوں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ دونوں سوکنیں بن جائیں گی۔ آپس میں رقابت اور عداوت پیدا ہوگی۔ اور ان کی محبت، نفرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ حکیمانہ تعبیر حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

اس قسم کی روایات کو اگر آپ تسلیم نہیں کریں گے تو اسلامی نظام قائم نہیں ہوگا۔ قرآنِ مجید کو سمجھنے کے لئے اخبار آحاد یعنی وہ روایتیں جن کے بیان کرنے والے ایک یا دو یا تین ثقہ راوی ہیں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صحیح روایات کو بھی قرآن فہمی میں دخل ہے اور ان کے بغیر ہم قرآن مجید کو نہیں سمجھ سکتے۔ اختصار کے پیش نظر انہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

# قرآن فہمی کا پانچواں ذریعہ......آثارِ صحابہ کرامؓ

اس کے بعد ایک ذریعہ آثارِ صحابہؓ کا ہے، صحابہ کرامؓ کے اقوال، بالخصوص عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، اُبی بن کعبؓ اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن مجید کی خدمت کی ہے۔ ان کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا ہے لہٰذا ان کی تفسیر کو مانا جائے گا۔ اگر کہیں ان میں اختلاف ہوتو جو قول قرآن مجید سے زیادہ قریب ہو، اس کو لیا جائے گا۔ یہ بھی ضروری ہے، اس کی مثال لیجئے:

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اس کی آیات میں تعارض پایا جاتا ہے، ٹکراؤ اور تصادم پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ 'ہاں' ہے، ایک جگہ 'نہیں' ہے تو وہاں ہم کیا کریں؟ انہوںؓ نے کہا کہ بتاؤ وہ کون سی آیات ہیں تاکہ میں بھی جانوں کہ تمہارے ذہن میں کیا خلجان ہے؟

سائل نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آتا ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین اللہ تعالیٰ کے دربار میں جا کر کہیں گے: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾(الانعام:۲۳) ''قسم اللہ کی! ہم تو مشرک نہیں تھے [ہم نے تو شرک نہیں کیا]'' وہ انکار کریں گے یعنی اس طرح وہ اپنے شرک کو چھپائیں گے جیسے دنیا کے رشوت خور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے تو رشوت نہیں لی۔ جبکہ دوسری آیات میں آتا ہے ﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا﴾ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔ یہاں ٹکراؤ ہوگیا کہ مشرکین نے چھپایا تو ہے جیسا کہ پہلی آیت میں ہے لیکن دوسری آیت میں آتا ہے کہ وہ چھپا نہیں سکیں گے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس وقت حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے وضاحت فرمائی کہ یہ ایک وقت میں نہیں بلکہ ایسا دو اوقات میں ہوگا۔ شروع میں تو کفار یہ سمجھیں گے کہ یہ دربار بھی ہمارے دنیاوی حکام اور بادشاہوں کی طرح ہے۔ اگر ہم یہاں جھوٹ بول دیں اور کچھ چھپالیں تو ہوسکتا ہے کہ کام چل جائے۔ اس بنا پر وہ کہیں گے کہ ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ وہ اس طرح جھوٹ بول دیں گے کیونکہ انہیں جھوٹ بولنے کی عادت رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد پھر یہ ہوگا کہ ﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾

(یٰسین:٦٥) ''اس دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں اس کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے'' ...... اللہ تعالیٰ مہر لگا دیں گے۔ جب مہر لگ جائے گی تو یہ اَعضا و جوارح گواہی دیں گے: منہ بند، زبان بند، مہر لگ گئی۔ اب یہ اعضا و جوارح، یہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان گواہی دیں گے کہ کیا دیکھا تھا، ہاتھوں سے کیا پکڑا تھا۔ قدم کہاں کہاں بڑھائے تھے، اس وقت کوئی بات نہیں چھپائی جا سکے گی۔ تو یہ دو مرحلے اور دو وقت ہیں۔ اب یہ ایک صحابیؓ کی تفسیر ہے۔ اس کے بعد اس آدمی نے ظاہراً قرآن کریم کی چند باہم متعارض آیات کا تذکرہ کیا جن کی حضرت ابن عباسؓ نے شافی وضاحت فرمائی، جیسا کہ کتبِ حدیث میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ لوگ حدیث میں اتنے مشغول ہوگئے ہیں کہ قرآن بھول گئے اور قرآن سے تعلق کم ہوگیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود محدثین نے جو خدمت کی ہے وہ تو قرآن مجید کی خدمت ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ سائل نے چار آیات پیش کیں اور ان سب کا جواب عبداللہ ابن عباسؓ دیتے ہیں۔ امام بخاریؒ اس کو تفسیر سورۂ حم سجدہ میں نقل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث جو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں وہ حقیقت میں قرآنِ مجید سے قریب ہوتے ہیں نہ کہ دور۔

اسی طرح ایک اور تفسیر سنئے: آج کل جو غلط ماحول چل رہا ہے اس میں شائد یہ تفسیر نہایت اچنبھے سے سنی جائے لیکن بہرحال ایک حق بات ہے، جس کو صاف کہہ دینا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں آتا ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں لھوالحدیث یعنی ایسی باتیں جو لھو ہیں۔ لھو کیا چیز ہے: كل كلام يلهي عن ذكر الله ''ہر وہ کلام جو اللہ کے ذکر سے غافل کردے وہ لھوالحدیث'' ...... اس کی تفسیر عبداللہ بن مسعودؓ کرتے ہیں، ترمذی کی روایت ہے۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں:

> ''والله الذي لا الله إلا هو اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لھوالحدیث کیا ہے؟ اس کا بڑا مصداق الغنا ہے یعنی ناچ گانے، یہ گانے بجانے۔ اس کا وہی نشہ ہے جو شراب کا ہوتا ہے۔''

اور دوسرے صحابیؓ اس کی تفسیر کرتے ہیں: الغناء ينبت النفاق ، غنا میں نفاق پیدا

کرتا ہے یعنی انسان اس طرح مست ہو جاتا ہے کہ اسے قرآن سے لذت حاصل نہیں ہوتی۔ بس وہ چاہتا ہے کہ ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے ذرائع سے اچھے سُر رکھنے والے مغنی اور مغنّیات کا گانا سنتا رہے۔ اس کو اسی میں لطف آتا ہے۔ اسی میں اُسے لذت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے لھو کی تفسیر غنا سے کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کے فہم کے لئے صحابہ کرامؓ کی تفسیر بھی قابل اعتماد ہے۔ بہت سے وہ مقامات جو ہمارے لئے مشکل ہیں، ان کو انہوںؓ نے حل کیا ہے۔ کیونکہ انؓ کے سامنے قرآنِ مجید نازل ہوا اور وہؓ جانتے تھے کہ رسول اکرمؐ نے کیا تفسیر کی ہے اور انہیںؓ کس طرح سمجھایا ہے۔

اس کے بعد تابعینؒ کے اَقوال ہیں جو صحابہؓ کے شاگرد تھے۔ قتادہؒ اور دوسرے تابعین ہیں ان کے اَقوال کو بھی دیکھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ تفسیر بالرائے جب بھی کوئی کرے گا تو اس سے قرآن نعوذ باللہ بازیچہ اَطفال بن جائے گا جیسے ایک صاحب نے تفسیر کی تھی:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰه وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَأُولِیْ الأَمْرِمِنْكُمْ﴾

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

أَطِيْعُو اللّٰه وَأَطِيْعُوْ الرَّسُوْلَ سے مراد انہوں نے مرکزِ ملت لیا۔ یعنی وہ حکومت جو اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کو چلانے کے لئے قائم ہو۔ اُولی الأمر سے مراد انہوں نے تھانیدار (حاکم وقت) وغیرہ کو لیا۔ اس طرح آدمی اپنے ذہن سے جو کچھ، اس میں غلط سلط بیٹھ گیا ہے، اس کے مطابق اپنی طرف سے تفسیر کرتا ہے اور قرآن مجید سے دور ہو جاتا ہے۔

## قرآن فہمی کا چھٹا ذریعہ......عربی زبان

قرآن مجید کے فہم کے لئے چھٹا ذریعہ عربی زبان ہے۔ تفسیر قرآن کے لئے عربی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ عربی زبان نہیں جانتے لیکن قرآن مجید کے مفسر بن جاتے ہیں۔ بلادِ عجم میں بھی ایسے لوگ ہیں اور پاکستان و ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں جو عربی نہیں جانتے لیکن انگریزی یا اُردو ترجمہ دیکھ کر تھوڑی سی ذہانت کی بنا پر مفسر قرآن بن بیٹھتے ہیں۔ یہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ بات ہے کہ آدمی قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتا ہو لیکن عربی زبان

سے نابلد ہو۔ زبان کا ذوق پیدا کیا جانا چاہئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے علامہ بن جائیں لیکن جب کوئی تفسیر لکھنے بیٹھے یا کوئی تفسیر بیان کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نے عربی زبان کی تعلیم میں کچھ وقت لگایا ہو۔

اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً ایک تفسیر قادیانیوں کے خلیفہ نورالدین نے بھی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تفسیر معاندانہ ہے، جاہلانہ نہیں ﴿فَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ اے موسیٰؑ! تم لے جاؤ اپنی جماعت کو پہاڑ پر۔ ضرب کے معنی مارنے کے آتے ہیں، اس کے معنی سفر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن میں آتا ہے ﴿إِذَا ضَرَبُوْا فِيْ الأَرْضِ﴾ اور عَصَا کے معنی جماعت کے بھی آتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ''شق عصا المسلمین'' یہاں عصا کے معنی جماعت کے ہیں۔ تو جماعت بھی انہوں نے لغت سے ثابت کردیا اور ضرب کے معنی بھی عرب لغت سے ثابت ہوگئے۔ حجر کے معنی پتھر کے ہیں یعنی اس سے پہاڑ مراد ہے کیونکہ وہ پتھروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ قادیانی اور اسی قسم کے لوگ چونکہ حدیث کے منکر ہیں، اس لئے انہوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ

''اے موسیٰ! اپنی جماعت کو پہاڑ پر لے جاؤ۔ پہاڑ کا سفر کراؤ، پہاڑ کی سیر کراؤ۔''

حالانکہ عربی قاعدہ سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ غلط ہوگا۔ اگر تھوڑی سی عربی آتی ہو تو ایسا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ ﴿فَاضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ﴾ ضرب کے بعد اگر فی آئے تو اس کے معنی سفر کے آتے ہیں۔ اگر فی نہ آئے تب اس کے معنی چلنے کے اور سفر کرنے کے نہیں آتے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی آیا ہے تو ضرب فی الارض اور ضربوا فی الارض جہاں کہیں بھی چلنے اور سفر کرنے کے معنی میں آیا ہے وہاں اس کے بعد فی آیا ہے۔ یہاں چونکہ فی نہیں آیا، اس لئے یہاں سفر کرنے کے معنی نہیں ہوسکتے۔

لغت اور عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر یہ ترجمہ کیا گیا ہے، اس لئے عربی جاننا ضروری ہے۔ کم سے کم اتنی عربی تو آئے کہ قرآن مجید کو سمجھ سکیں۔ ترجمہ کی مثال اس طرح سمجھئے کہ ایک چیز تو ہوتی ہے لسی اور ایک ہوتا ہے خالص دودھ۔ جو مزہ خالص دودھ میں ہوتا ہے وہ لسی میں نہیں ہے۔ ترجمہ، ترجمہ ہے، ترجمہ کے اندر بھی مترجم کا کچھ نہ کچھ تخیل آجاتا ہے۔ اس کے کچھ خیالات اور جذبات تو اس میں آجاتے ہیں لیکن کلام کی اصل معنویت اور فصاحت

وبلاغت انسان پا نہیں سکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عربی زبان کی نزاکتوں سے واقفیت ہو تو پھر قرآن مجید کا فہم، اس کی حلاوت، اس کی مٹھاس اور اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ ورنہ ترجمہ سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حلال کیا ہے، حرام کیا ہے، اللہ تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے اور کیا ناپسند۔ میں سمجھتا ہوں کہ بوڑھے بوڑھے لوگ اب اس عمر میں عربی کیا پڑھیں گے لیکن نوجوانوں کو سوچنا چاہیے کہ عربی زبان سیکھیں۔ جتنا وقت وہ معاش اور دوسرے کاموں میں صرف کرتے ہیں اس میں روزانہ یا ہفتہ میں کم از کم دو تین گھنٹے عربی زبان سیکھنے کے لئے نکالیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو حقیقت میں وہ قرآن مجید کے بہت قریب ہو جائیں گے۔ اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے غلط انداز اختیار کیا ہے لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ایک عیسائی کے اعتراض کا جواب: 'رحمٰن' اور 'رحیم' کا مادہ ایک ہی ہے تو یہ دونوں لفظ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ رحمٰن اور رحیم میں فرق ہے۔ رحمان بروزن فعلان جس کے مفہوم میں جوش اور تلاطم پایا جاتا ہے، رَحِیْمٌ بروزن فَعِیْلٌ اس کے مفہوم میں دوام اور پائیداری پائی جاتی ہے، یعنی رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت بے پایاں ہے گویا رحمت کا سمندر جوش مار رہا ہے، رحیم کا مطلب ہے وہ ہستی جس کی رحمت ہمیشہ رہنے والی ہے، کبھی ختم نہ ہوگی۔

## عربوں کے تمدن سے واقفیت

اسی طرح عربوں کے تمدن اور ان کی عادات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ جس ماحول میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اس سے بھی ہم باخبر ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا ، وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوْا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ (البقرۃ:۱۸۹) ''یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم مکان کے پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو اور دروازہ سے داخل ہو۔''

اب اس سے کیا سمجھا جائے، اس کا کیا مطلب ہے، ایسا کیوں فرمایا گیا ہے؟ اس آیت کو صحیح سمجھنے کے لئے عربوں کی عادات اور ان کے تمدن سے واقفیت ضروری ہے۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ طواف کرنے جاتے تھے اور طواف کرکے واپس آتے تھے تو جس

دروازے سے جاتے، اس سے واپس نہیں آتے تھے۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ طواف کرنے کے بعد اب پاک ہوگئے ہیں۔ اس لئے اس ناپاک دروازے سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ پچھواڑے سے داخل ہوں گے۔ اب اگر ہمیں ان کی یہ عادت معلوم ہے تو قرآن مجید کا بیان سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے نیکی کے اس تصور کی تردید کی ہے کہ اگلے دروازے سے نہ آیا جائے بلکہ پچھواڑے سے آیا جائے، یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ نیکی تو تقویٰ کا نام ہے۔

## کتبِ سماویہ کی معرفت

اسی طرح قرآنِ مجید کو سمجھنے کے لئے کتبِ سماوی بھی معاون ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ایک بڑا لمبا معاملہ ہے، لیکن جو لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھیں تو ایسی تفسیر جس میں موازنہ کیا گیا ہو، سمجھنے کیلئے بڑی معاون ثابت ہوتی ہے وبضدھا تتبین الأشیاء ضد سے اشیا کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، نور کی قدر ظلمت سے ہوتی ہے۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو روشنی کی قدر ہوتی ہے۔ جب بجلی آ جاتی ہے تو روشنی ہو جاتی ہے اور خوشی ہوتی ہے۔

اسی طرح بائبل اور تورات میں موجود چیزوں کو سامنے رکھ کر قرآن مجید پڑھیں تو کہیں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے اور بعض الفاظ کے اضافہ کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوَاتِ وَالأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ (سورۃ ق: ۳۸) کہ ”ہم نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی“۔ یہ کیوں فرمایا گیا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کون ہے مسلمان جو ایسا سمجھے؟ بلکہ یہ مشرکین کا بھی عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ عزوجل تھک جاتے ہیں۔ لیکن جب تورات دیکھی تو کتاب پیدائش میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان اور زمین بنائے اور ساتویں دن آرام کیا۔ تو قرآن مجید نے کہا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ اگر تورات کا بیان سامنے ہو تو ﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ﴾ کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف انہوں نے کیسی صفت منسوب کر دی۔

اسی طرح سورۃ الشّمس میں آتا ہے ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا وَلاَ

يَخَافُ عُقْبٰهَا﴾(آیت:۱۵)''قومِ ثمود کو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے تباہ کردیا اور اللہ تعالیٰ کسی کے انجام کا خوف نہیں رکھتا'' سو اس نے تباہ کردیا۔ اسے کوئی خوف نہیں ہے، کوئی ڈر نہیں کہ کیوں تباہ کیا ہے۔ یہ اس وجہ سے فرمایا کہ تورات کی کتاب الخروج میں لکھا ہے کہ قومِ ثمود کو تباہ کرنے کے بعد اللہ سبحانہ پچھتائے یعنی خدا پچھتایا، افسوس کیا اور نادم ہوا، اس لئے قرآنِ مجید میں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ ثمود کو اس کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کردیا۔ اس کے انجام سے اللہ تعالیٰ کو کوئی خوف نہیں۔ پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو قادرِ مطلق ہے، اس کو انسانوں پر قیاس کیوں کرتے ہو؟ یہ مختلف ذرائع ہیں جن کی بنا پر ہم قرآن مجید کو سمجھ سکتے اور اس پر غور کرسکتے ہیں۔

## فہم قرآن کے لئے صرف لغت کافی نہیں

قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے، حدیث سے اور پھر لغت سے۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ لغت کافی نہیں ہے کہ سنت کو آپ چھوڑ کر محض لغت کو لے بیٹھیں۔ 'قاموس' یا 'المنجد' کو لے کر بیٹھ جائیں کہ قرآن کو حل کرلیں گے، بہت بڑا مغالطہ ہے۔ بہت سے کلمات، بہت سے اَلفاظ ایسے ہیں کہ جن کی تشریح شارع نے کی ہے لیکن لغت میں اس کے کچھ اور معنی ہیں۔ اَب لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا (Prayer,Pray) کے آتے ہیں لیکن صلوٰۃ صرف دعا تو نہیں ہے۔ صلوٰۃ دین کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ حج کے معنی عربی زبان میں 'قصد کرنے' کے آتے ہیں لیکن شریعت میں اس اصطلاح کے ایک خاص معنی ہیں۔ یہ ایک عبادت ہے جس کے خاص آداب، خاص شرائط اور خاص تعریف ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ اور صوم ہے۔ صوم 'صبر' کے معنی میں آتا ہے لیکن شریعت میں اس کے کچھ اور معنی ہیں۔ لہٰذا بہت سے اَلفاظ شریعت کے ایسے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے لغت کافی نہیں ہے۔ لیکن بہرحال بہت سے اَلفاظ قرآن مجید میں ایسے بھی ہیں کہ جن کے لئے ہمیں لغت کی ضرورت پڑتی ہے نیز جاہلیت کے اَشعار کی مدد سے بھی ہم قرآن مجید سمجھ سکتے ہیں۔

# قرآن فہمی کی راہ میں موانع

## ① ذہن میں ایک نظریہ/خیال بٹھا کر قرآن سے اسکی تائید تلاش کرنا

کچھ موانع اور رکاوٹیں ایسی ہیں جو قرآن فہمی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انسان ایک خیال اپنے دل میں جما لیتا ہے اور پھر قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے کہ میں نے جو خیال اپنے دل میں جما لیا ہے یا کسی قوم سے چرا لیا ہے یا کسی کی نقالی کی ہے، وہ خیال، وہ نظریہ، وہ فکر اب میں قرآن مجید سے ثابت کروں حالانکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر پڑھے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید کیا رہنمائی دیتا ہے۔تب تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ایک شخص اگر اشتراکی ذہن رکھتا ہے، اب وہ اگر قرآن مجید پڑھے گا تو کوشش یہ کرے گا کہ ہر جگہ وہ ایسی آیت ڈھونڈے یا ایسا معنی بیان کرے کہ جس سے انفرادی ملکیت کی نفی ہو اور قومی ملکیت ثابت ہو۔اسی طرح ایک سرمایہ دار یا بہت بڑا جاگیردار ہے۔اس کی خواہش یہ ہوگی کہ میں قرآن سے ایسی آیتیں تلاش کروں اور ایسا مطلب نکالوں کہ جس سے سود بھی جائز ہو جائے اور ساری چیزیں جائز ہو جائیں، حرام بھی حلال ہو جائے۔ یہ رویہ انتہائی خطرناک ہے جس کی بنا پر ہم قرآن مجید سے بہت دور ہو جائیں گے۔

## قرآن کریم میں لفظ 'حدیث' کا معنی؟

اسی طرح ایک اور مثال دیکھیں کہ جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے۔اب جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو ہر جگہ انہیں نظر آتا ہے کہ حدیث حجت نہیں ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں، انہوں نے کتاب لکھی: ''مقامِ حدیث'' اس میں لکھا ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ﴾ کا ترجمہ کیا: کس حدیث پر وہ

ایمان لائیں گے قرآن کے بعد؟ یہاں حدیث کا انکار کردیا۔ حالانکہ یہاں حدیث کے لغوی معنی مراد ہیں 'بات' اور بات کے معنی ہیں یعنی کس بات پر؟

یا مثلاً سورۂ لقمان کی یہ آیت پڑھ ڈالی ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (آیت:٦)

''لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو اس لیے بیہودگی خریدتا ہے کہ بغیر علم کے اللہ کی راہ سے بہکا دے اور اسی کا مذاق اڑائے، ایسے ہی لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

اس کا ترجمہ ایک منکر حدیث نے اس طرح کیا ہے کہ ''لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں حدیث کے مشغلے'' جو دماغ میں پہلے سے لایا ہوا خیال رفتور ہے تو لھو الحدیث سے وہی مراد لے لیا۔ حالانکہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ 'لہو الحدیث' کے معنی ہیں ہر وہ کام یا بات جو اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی ہو۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ لفظ حدیث جو قرآن مجید میں آیا ہے اس کے معنی بات کے، کلام کے ہیں۔ اب یہ کلام اللہ تعالیٰ کا بھی ہوسکتا ہے اور رسول اکرمؐ کا بھی۔ کلام صحابہؓ اور مؤمنین کا بھی ہوسکتا ہے اور یہ کلام کافروں، مشرکوں اور منافقوں کا بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں لغوی معنی مراد ہیں حدیث کے، اصطلاحی معنی مراد نہیں۔ قرآن مجید میں جو حدیث کا لفظ آیا ہے وہ لغت کے لحاظ سے آیا ہے، اس سے حدیثِ رسولؐ مراد نہیں ہے۔

مثلاً قرآن میں آتا ہے ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ (زمر: ٢٣) ''اللہ نے بہترین کلام نازل کیا جو ایسی کتاب ہے جس کے مضامین ملتے جلتے اور بار بار دہرائے جاتے ہیں'' یہاں حدیث سے قرآن مجید مراد ہے یعنی تمام کلاموں میں بہترین کلام اسی طرح قرآنِ مجید میں آتا ہے: ﴿مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (یوسف: ١١١)

''یہ قرآن کوئی ایسی باتیں نہیں جو گھڑ لی گئی ہوں بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کیلئے یہ ہدایت اور رحمت ہے۔''

حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ بات جو ہم نے بیان کی ہے، کوئی گھڑی ہوئی نہیں، کوئی افترا نہیں ہے۔

اسی طرح سورۃ کہف کے شروع میں فرمایا ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى اٰثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴾ (آیت ٦) کہ ''اے نبیؐ! تم اپنے آپ کو اسی افسوس میں ہلاک کرلو گے کہ یہ لوگ اس حدیث پر ایمان نہیں لاتے''۔ یہاں حدیث سے مراد کیا ہے: قرآنِ مجید۔

کلام اللہ کو بھی حدیث کہتے ہیں، اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی بات کو بھی قرآن مجید میں حدیث کہا گیا ہے۔ سورۃ التحریم میں فرمایا: ﴿وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلٰى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيْثًا﴾ (آیت ٣) کہ ''جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک بیوی سے ایک بھید کی بات کہی''۔

صحابہ کرامؓ کی بات کو اور مؤمنین کی بات کو بھی حدیث کہا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں فرمایا: ﴿وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ﴾ یعنی کھانا کھانے کے بعد نبی اکرم ﷺ کے گھر میں بیٹھ کر گپ شپ مت کرو۔ اس سے نبی اکرم ﷺ کو تکلیف ہوتی ہے۔ (آیت ٥٣)

یہ حدیث کا لفظ کفار اور مشرکین کے اَقوال اور ان کی بات چیت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَالْحَدِيْثِ﴾

اور دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ اٰيَاتِ اللّٰهِ يُكْفَرُبِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ﴾ (النساء: ١٤٠) یعنی وہ جب کوئی ایسی بات کر رہے ہوں جس میں استہزا ہو، مذاق اڑا رہے ہوں، تو مسلمانوں کو چاہئے ان کے پاس مت بیٹھیں۔ ان کی مجلس میں نہ بیٹھیں یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں۔

لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمارا جو خیال اور عقیدہ ہے، اس کے مطابق قرآن مجید سے کھینچا تانی کر کے مسئلہ نکالیں۔ دراصل یہ قرآن فہمی نہیں بلکہ قرآن دشمنی ہے۔

## ② قرآن کریم کو تعصّبات سے پاک ہو کر نہ پڑھنا

قرآن مجید کے فہم کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہر قسم کے

تعصب سے اور ہر قسم کی عصبیت سے پاک ہو کر اگر قرآن مجید کو پڑھیں گے تب تو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی عقیدہ، کوئی فکر، کوئی اِزم اپنے ذہن میں لے کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں گے تو قرآن مجید سے اور دور ہو جائیں گے۔ لوگوں نے تو یہاں تک مذاق کیا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيْثِ میں مذکور حدیث کو حدیثِ نبوی قرار دے لیا ہے، اسے تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی طرح ایک چیز اور بھی ہے جو بظاہر ہنسی کی بات ہے لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مسلمان فرقہ وارانہ تعصب کی بنا پر قرآن مجید سے دور ہو گئے۔ ایک ایسے صاحب جو حضرت علیؓ کے بہت چاہنے والے تھے، نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ بھی 'شیعہ' تھے اور دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ ڈالی ﴿وَإِنَّ مِنْ شِيْعَتِهِ لَإِبْرَاهِيْمَ﴾ الصافات: ۸۲) یعنی حضرت ابراہیم شیعہ تھے۔ 'سنیوں' نے جواب میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ دی ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ الانعام: ۱۶۰) ''جنھوں نے دین میں تفریق ڈالی وہ سب شیعہ ہیں، اور اے نبی! آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں''۔

اور دوسری آیت پڑھ دی

﴿ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ مریم: ۶۹)

''پھر ہر گروہ میں سے ہم ایسے لوگوں کو کھینچ نکالیں گے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ پر سخت سرکش تھے''۔

حالانکہ 'شیعہ' کے معنی جماعت کے ہیں۔ حدیث کے معنی سمجھنے میں جو غلطی کی گئی ہے یہاں بھی وہی کی جا رہی ہے۔ شیعہ کا جو مفہوم مشہور ہو گیا، اس کو سامنے رکھا گیا ہے۔ لفظ شیعہ جو قرآن مجید میں آیا ہے، اس کے معنی جماعت کے ہیں۔ گروہ کسی کا ہو، وہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی لیکن وہ اس کو اپنی جماعت پر، اپنے گروہ پر، یا اپنے فرقہ پر چسپاں کرنے کے لئے یا مخالفین کو جواب دینے کے لئے قرآن مجید کو استعمال کرتے ہیں۔ مذہبی فرقہ وارانہ ذہنیت سے بھی انسان قرآن مجید سے دور ہو جاتا اور قرآن کو ایک کھیل بنا لیتا ہے۔

## ③ قرآن مجید کو سمجھ کر نہ پڑھنا

قرآن فہمی کے موانع میں سے ایک یہ ہے کہ انسان قرآن مجید پڑھتا ہے لیکن اس کو سمجھتا

نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بس تبرکاً پڑھ لینا ہی کافی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ایک بار کہا تھا کہ

سب سے مظلوم کتاب قرآنِ مجید ہے۔ اس لئے کہ ساری کتابیں اور ساری تحریریں سمجھ کر پڑھی جاتی ہیں، لیکن قرآن مجید ہی ایک ایسی مظلوم کتاب ہے کہ جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہم بے سمجھے ہی اس کو پڑھ لیں تو یہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اور اس طرح ہی قرآن مجید کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

حالانکہ حقیقتاً 'قراء' کا لفظ جو قرآن وحدیث میں آیا ہے یا مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے ارکان 'قراء' تھے۔ تو قراء سے مراد جاہل قاری نہیں ہیں جو حرف کا مخرج تو نکال سکتے ہیں لیکن قرآن مجید کے معنی نہیں جانتے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے جو ارکان تھے وہ قراء تھے یعنی وہ علماء تھے، کتاب وسنت کے عالم تھے، قراء کے معنی پڑھنے والوں کے ہیں کہ آدمی سمجھ کر پڑھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے سمجھے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا تو ثواب نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ثواب دینے والا ہے۔ اس کے خزانہ میں کیا کمی ہے، میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ قرآن مجید کا تقاضا کیا ہے، وہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟

پھر ہم میں ایک اور عجیب بات ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو تبرک سمجھا ہوا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ شاہی مسجد لاہور میں ایک صاحب بڑی محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے سونے کے تاروں سے قرآن مجید لکھنا شروع کیا بلکہ ختم کر لیا ہے۔ اب لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں گویا یہ بڑا کمال ہے۔ اب قرآن مجید سونے کے تاروں سے لکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ آپ قرآن مجید پڑھنے کا اور اس کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایسا طریقہ اختیار کیجئے کہ جس سے دل کے تار ہل جائیں ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس: ۵۷)

''یہ تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت ہے اور سینوں میں جو روگ ہیں، ان کیلئے شفا ہے۔''

## کیا قرآن مجید محض تبرک کے لئے ہے!

ویسے آج کل ایک اور بیماری ہے۔ وہ یہ کہ آج کل تعویذ گنڈے بہت چل رہے ہیں۔

بہت سی کتابیں لکھ دی گئی ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نزلہ، زکام، کھانسی، بخار کے علاج کے لئے ہے۔ عورت کے بچہ ہونے والا ہے تو فال کھولی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایسا کرو، ویسا کرو۔ گویا کہ یہ ہمارے حکیم وڈاکٹر سب بیکار ہوگئے اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن مجید بس اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ توپ تو بنی تھی دشمنوں کو مارنے کے لئے لیکن ہم اس سے مچھر مکھی مار رہے ہیں۔ مچھر اور مکھی اس سے مر تو جائیں گے لیکن توپ اس لئے بنائی نہیں گئی۔ قرآن مجید کی آیتوں کے نقش بنائے جاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس طرح یہ لوگ قرآن مجید سے مسلمانوں کو دور کر رہے ہیں۔

ایک اور بڑا مسئلہ ہے، جس کا ہمارے ہاں عام رواج ہے۔ ممکن ہے بہت سے حضرات اس کو نامانوس محسوس کریں وہ ہے: قرآن خوانی۔ قرآن دانی کی بجائے قرآن خوانی۔ قرآن خوانی کا رواج بہت ہے۔ اگر کوئی مر جائے اور اس نے ساری عمر قرآن نہ پڑھا ہو، اور پڑھنے والے کو بھی قرآن پڑھنا نہ آتا ہو لیکن لوگ جمع ہوتے ہیں۔ تیجا چالیسواں کیا کچھ ہوتا ہے تا کہ قرآن مجید پڑھ کر مردے کو ثواب پہنچایا جائے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن مجید میں کتنی بار آیا ہے ﴿ أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ نماز قائم کرنے پر تو عمل نہیں ہوتا لیکن آپ قرآن خوانی کر رہے ہیں۔ قرآن خوانی کافی نہیں ہے، قرآن دانی ضروری ہے۔ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قبر میں جو دفن ہو گیا ہے قرآن مجید اس کو بخشوانے کے لئے ہے اور بس، ہمارے لئے نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارے لئے ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں جو اخلاقی بیماریاں، روحانی امراض اور عقائد کے روگ ہیں، ان کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے جو چلتے پھرتے مردے نظر آ رہے ہیں، ان کا علاج قرآن میں ہے۔ جو قبر میں چلے گئے، ان کا معاملہ اللہ کے ہاں ہے۔ اب آپ چاہے کتنا ہی پڑھتے رہیں۔ یہ ایسا ہے جیسے عیسائیوں میں رواج ہوا کرتا تھا کہ جب کوئی مر گیا تو نجات نامہ، ویزا، جنت کا پرمٹ دیا کرتے تھے۔ مردہ کے سینے پر لکھ کر لگا دیا کرتے تھے کہ یہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ سیدھا جنت میں جائے گا۔ یسوع مسیحؑ کی بادشاہت میں جائے گا۔ اسی طرح ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے، یہی وجہ ہے کہ

ہمارے ہاں ایصالِ ثواب کا رواج ہو گیا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ایصالِ ثواب کلیۃً غلط ہے، لیکن یہ جو موجودہ اجتماعی شکل میں رواج بن گیا ہے، یہ بالاتفاق غلط ہے البتہ اگر کوئی انفرادی طور پر کچھ پڑھ لیتا ہے اور ثواب پہنچا دیتا ہے تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ بعض اس کے قائل ہیں، بعض نہیں۔ جس کو صدمہ پہنچا ہے وہ قرآن مجید پڑھ کر مغفرت کی دعا کرے تو اس کی گنجائش شریعت میں نکل سکتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ کہ برادری کے تمام لوگ جمع کر لئے جائیں اور جس کے ہاں غمی ہوئی ہے، اسے کھانا بھی کھلانا پڑے، آخر یہ کیا چیز ہے؟

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید تو قبر والوں کے لئے ہے۔ جو قبر سے باہر ہیں، ان کے لئے نہیں ہے؟ یہ چیز درحقیقت ہمیں قرآن مجید سے دور کر رہی ہے۔ یہ بڑا افسوسناک طرزِ عمل ہے۔ یہ قرآن فہمی اور قرآن دانی میں رکاوٹ ہے۔ اس کے علاوہ لوگ قرآن مجید سے فال نکالتے ہیں۔ عدالتوں میں قرآن مجید پر حلف اٹھاتے ہیں۔ سچے ہوں یا جھوٹے ہوں، قرآن مجید کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ دلہن اگر جارہی ہو تو قرآن مجید اچھے غلاف میں لپیٹ کر جہیز میں دے دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ اسے ساری عمر نہ پڑھے۔ جذبہ تو بہت اچھا ہے لیکن پہلے اسے پڑھایا تو ہوتا۔ پہلے اس میں قرآن مجید کا ذوق وشوق تو پیدا کیا ہوتا تاکہ بعد میں اپنے شوہر کے ہاں جائے تو سمجھ کر پڑھ سکے۔ اس پر عمل کر سکے اور اپنے بچوں کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تربیت دے سکے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اسلام آئے اور قرآن مجید اور سنت کا نظام جاری ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو اسے صحیح معنی میں سمجھا یا جائے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے اور جو باتیں میں نے صحیح بیان کی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے اور جو غلط بات کہی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے سینے سے اسے محو کر دے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

---

☆ یہ مضمون ماہنامہ محدث کے اپریل ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ جس کے بعض مباحث پر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے نقد ونظر تحریر کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا مضمون بھی اسی کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

حصہ دوم

# قرآن فہمی میں حدیثِ نبویؐ کی اہمیت

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

قرآنِ کریم کے درس کے حوالہ سے قرآن فہمی کے بنیادی اُصولوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ غلط فہمی آج پھر عام ہورہی ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لئے صرف عربی زبان جان لینا کافی ہے اور جو شخص عربی زبان پر، گرامر اور لٹریچر پر عبور رکھتا ہے، وہ براہِ راست قرآنِ کریم کی جس آیت کا مفہوم سمجھ لے، وہی درست ہے۔ یہ گمراہی ہے اور قرآن فہمی کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں بنیادی گزارش یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو صحیح طور پر سمجھنے اور اس کی آیات کا مصداق ومفہوم معلوم کرنے کے لئے سنتِ نبویؐ سب سے بڑی بنیاد ہے کیونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ہمیں قرآنِ کریم ملا ہے اور انہوں نے قرآنِ کریم کے صرف الفاظ ہی ہم تک نہیں پہنچائے بلکہ اس کی تعلیم بھی دی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرم ﷺ کے منصبی فرائض میں دو باتوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے: ایک ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ﴾ آپؐ لوگوں کو قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور دوسرا ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ﴾ کہ لوگوں کو قرآنِ پاک کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ يَتْلُوْا کا تعلق الفاظ سے ہے اور يُعَلِّمُهُمْ کا تعلق ان الفاظ کے معنی ومفہوم سے ہے اور یہ دونوں باتیں جناب نبی اکرم ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ہیں۔ اس لئے ایسا نہیں ہوا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے (نعوذ باللہ) ایک چٹھی رساں کے طور پر قرآن کریم اُمت کے حوالہ کردیا ہو اور خود فارغ ہوگئے ہوں بلکہ انہوں نے قرآنِ کریم کے

الفاظ و آیات پڑھ کر سنانے اور انہیں اُمت کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل ۲۳ برس تک ان کی تعلیم بھی دی ہے اور وہی تعلیم سنتِ نبویؐ ہے جو قرآنِ کریم کی صرف تشریح و بیان ہی نہیں بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے کیونکہ سنت و حدیث پر ایمان لائے بغیر قرآنِ کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔

## حدیثِ نبوی کے بغیر قرآنِ کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں!

حضرت امام شافعیؒ سے ایک جملہ منسوب ہے کہ القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى القرآن" سنت قرآنِ کریم کی اتنی محتاج نہیں ہے جتنا قرآنِ کریم سنت کا محتاج ہے۔ اس جملہ کا مطلب عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم متن ہے اور سنتِ رسولؐ اسکی شرح ہے، اسلئے شرح کے بغیر متن کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے جبکہ شرح میں متن خود بخود موجود ہوتا ہے مگر میں اس جملہ کو اور مفہوم میں لیتا ہوں اور اسکی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

ایک جگہ گفتگو ہو رہی تھی کہ قرآن کریم کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور حدیث و سنت چونکہ اختلافات کا ذریعہ بنتی ہیں، اس لئے انہیں قرآنِ کریم کے ساتھ لازم قرار دینا درست نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حدیث کے بغیر تو خود قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی سب سے چھوٹی سورت 'الکوثر' ہے جو تین چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی شخص انکار کر دیتا ہے کہ میں سارے قرآن کریم کو مانتا ہوں مگر اس سورت کو قرآنِ کریم کا حصہ نہیں مانتا تو ہمیں اس کے سامنے اس سورت کو قرآنِ کریم کا حصہ ثابت کرنے کے لئے کوئی اتھارٹی پیش کرنا ہوگی کہ ہم کس کے کہنے پر سورۃ الکوثر کو قرآنِ کریم کا حصہ مان رہے ہیں؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو براہِ راست ہمیں کچھ نہیں فرمایا اور نہ ہی جبریل علیہ السلام سے ہمارا کوئی رابطہ ہے، ہمارے سامنے تو اس بارے میں ایک ہی اتھارٹی ہے اور وہ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جنھوں نے جس جملہ اور آیت کو قرآنِ کریم کا حصہ قرار دیا، اسے ہم نے قرآنِ کریم کا جزو تسلیم کر لیا۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس قرآنِ کریم کی آیات، سورتوں اور الفاظ کے تعین کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے

سورۃ الکوثر کے حوالہ سے بھی اتھارٹی جناب نبی اکرم ﷺ ہی کی ذاتِ اقدس ہے۔ چونکہ انہوں نے سورۃ الکوثر کو قرآنِ کریم میں شامل کیا ہے، اس لئے یہ سورت کتاب اللہ کا حصہ ہے ورنہ اس سلسلے میں اور کوئی ذریعہ اور اتھارٹی ہمیں میسر نہیں ہے تو جب یہ طے ہوگیا کہ ہم نے سورۃ الکوثر کو قرآنِ کریم کا حصہ اس لئے تسلیم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو پھر ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے'' کے جملہ کو آپ کیا کہیں گے؟ یہ حدیث ہے اور آپ خود غور فرمالیں کہ ہم پہلے حدیث پر ایمان لائے ہیں یا قرآنِ کریم پر؟ اسی لئے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ رتبہ اور مقام میں قرآنِ کریم حدیث سے مقدم ہے مگر ایمان کی ترتیب میں حدیث قرآنِ کریم سے پہلے ہے کیونکہ جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ ہو، قرآنِ کریم پر ایمان لانا ممکن بھی نہیں ہے اور امام شافعیؒ کے مذکورہ جملہ کو میں اسی مفہوم میں لیتا ہوں۔

## قرآن اور سنت کا تعلق قول اور عمل کا ہے!

لہٰذا سنت و حدیث نہ صرف قرآنِ کریم کی تشریح اور اس کا بیان ہے بلکہ اس پر ایمان کی بنیاد بھی ہے اور قرآنِ کریم کے ساتھ سنت کا تعلق قول اور عمل کا تعلق ہے اور یہ بات اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ کان خلقه القرآن ''رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و عادات قرآنِ کریم تھے۔'' یعنی وہ قرآن کریم جو الفاظ میں تلاوت کیا جاتا اور سنا جاتا ہے، اسے اگر عمل و کردار اور اخلاق و عادات کی شکل میں دیکھنا چاہو تو وہ جناب نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرت و سنت ہے۔ اسے یوں سمجھ لیجئے جیسے سکول اور کالج میں ایک استاد کلاس روم میں سائنس کا ایک فارمولا پڑھاتا ہے اور پھر لیبارٹری میں اسے عملی مرحلہ سے گزار کر دکھاتا ہے۔ جو کچھ اس نے کلاس روم میں پڑھایا ہے، اسے تھیوری کہتے ہیں اور جس عملی تجربہ کا مظاہرہ لیبارٹری میں کیا ہے، وہ پریکٹیکل ہے جو اس تھیوری کی عملی شکل ہے۔

## قرآنِ کریم پر نبی اکرم ﷺ نے سب سے بہتر طور پر عمل کیا

اس سے ہٹ کر ایک اور انداز میں بھی بات کو دیکھ لیں۔ وہ یہ کہ کسی عام شخص سے یہ سوال

کریں کہ اس قرآنِ کریم پر پوری نسل انسانی میں کس شخصیت نے سب سے زیادہ عمل کیا ہے؟ اس کے جواب میں کوئی شخص بھی جناب نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی اور نام نہیں لے گا اور نہ ہی لے سکتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ جس کا عمل کتاب اللہ پر سب سے زیادہ مکمل ہوگا، وہی اس پر عمل میں دوسروں کے لئے نمونہ اور معیار بنے گا اور اس لئے خود قرآنِ کریم نے جناب نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کو پوری اُمت کے لئے 'اسوۂ حسنہ' قرار دیا ہے۔

## قرآن فہمی میں حدیثِ نبوی کو ترجیح دینا ازبس ضروری ہے!

اس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سنتِ نبویؐ کے بغیر قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنا ممکن نہیں ہے اور یہ دعویٰ کرنا گمراہی ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لئے صرف عربی گرامر اور لٹریچر پر عبور کافی ہے۔ اس پر چند واقعات عرض کروں گا کہ حضرات صحابہ کرامؓ عرب تھے اور عربی ان کی مادری زبان تھی مگر بعض مواقع ایسے آئے کہ انہیں قرآن کریم کے الفاظ و احکام کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی اور جب نبی ﷺ نے وضاحت فرمائی تو وہ قرآن کریم کی مراد سمجھ سکے۔

① حاتم طائی عرب کے مشہور سخی ہیں جن کی سخاوت کے قصے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انہوں نے جناب نبی اکرم ﷺ کا زمانہ نہیں پایا، البتہ چونکہ وہ تاریخی روایات کے مطابق، بت پرستی ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دنیا میں رائج الوقت حق مذہب عیسائیت ہی تھا، اس لئے حاتم طائی کو اہل حق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا بیٹا عدیؓ اور بیٹی سفانہؓ دونوں صحابی ہیں۔ انہی عدی بن حاتمؓ کا قصہ ہے کہ جب رمضان المبارک میں سحری کا حکم نازل ہوا کہ ''اس وقت تک سحری میں کھا پی سکتے ہو جب تک سفید اور سیاہ دھاریاں الگ الگ ظاہر نہ ہو جائیں۔'' یہاں قرآنِ کریم کی مراد طلوعِ فجر کے وقت مشرق کی جانب آسمان پر نظر آنے والی سفید روشنی اور سیاہ اندھیرے کی دھاریاں ہیں جن کا الگ الگ نظر آنا طلوعِ فجر کی علامت ہے اور اسی کے ساتھ سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے مگر عدی بن حاتمؓ نے یہ کیا کہ دھاگے کی سفید اور سیاہ ڈوریاں اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیں اور سحری کے وقت انہیں دیکھ کر کھاتے پیتے رہے اور جب وہ الگ الگ دکھائی دینے لگیں تو کھانا

پینا چھوڑ دیتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک روز جناب رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضورؐ مسکرائے اور فرمایا کہ "إذا لو سادتك عريضة يا عدي" پھر تو اے عدیؓ! تیری تکیہ بہت چوڑا ہے یعنی سفید اور سیاہ دھاریوں سے قرآن کریم نے جو مراد لیا ہے، وہ اگر تکیے کے نیچے آ جاتا ہے تو پھر تو وہ تکیہ بہت چوڑا ہوگا۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے قرآنِ کریم کی مراد واضح کی تو عدی بن حاتمؓ بات کو سمجھے اور تکیہ کے نیچے سے دھاگے کی ڈوریاں نکال لیں۔

اب غور فرمائیے کہ عدی بن حاتمؓ عرب ہیں، عرب کے بیٹے ہیں اور سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں مگر قرآنِ کریم کا بیان کردہ محاورہ سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے اور اس وقت تک قرآنِ کریم کا مطلب نہیں سمجھ پائے جب تک خود حضور ﷺ نے اس کی وضاحت نہیں فرما دی۔ اس لئے اگر آج کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ محض عربی دانی کے زور پر قرآن کریم کا مفہوم و مراد کو پا سکتا ہے تو یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟

② یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے اور کسی بھی شخص کو ذاتی طور پر اس قسم کا مغالطہ ہوسکتا ہے، اس لئے اجتماعی واقعہ بھی عرض کر دیتا ہوں۔ یہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ جب سورۃ الانعام کی آیت ۸۲ نازل ہوئی:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

"جو لوگ ایمان لائے پھر اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا۔ انہی کے لیے امن وسلامتی ہے اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔" (الانعام:۸۲)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس نہ ہونے دیا، وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور انہی کے لئے امن ہوگا۔" تو صحابہ کرامؓ میں بے چینی پھیل گئی۔ انہوں نے ظلم کا عام مفہوم سمجھا کہ لوگوں میں باہمی معاملات و حقوق اور لین دین میں جو کمی بیشی اور حق تلفی ہوجاتی ہے، وہ ظلم ہے اور بلا شبہ 'ظلم' کا عمومی مفہوم یہی ہے مگر پریشانی اس بات پر ہوئی کہ یہ کمی بیشی تو انسانی معاشرت کا حصہ ہے اور روزمرہ معاملات میں کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی ہے، اس سے مکمل گریز کو اگر ایمان و ہدایت کے لئے شرط قرار دیا

جائے تو بہت کم لوگوں کا ایمان قبولیت کے معیار پر پورا اُترے گا، صحابہ کرامؓ کی پریشانی اس حد تک بڑھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ حضرات پیش ہوئے اور اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ وأينا لم يظلم يا رسول الله ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہو جاتی ؟'' معصوم تو صرف پیغمبر ہیں، باقی لوگ تو نہیں ہیں اور معاملات میں تھوڑی بہت کمی بیشی ہوتی ہی رہتی ہے، اس لئے ایمان و ہدایت کا یہ معیار بہت سخت ہے کہ ایمان کے ساتھ ظلم کا التباس بھی نہ ہو۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ بات سن کر صحابہ کرامؓ کو تسلی دی کہ یہ پریشانی بجا ہے مگر یہاں ظلم سے مراد وہ ہے جو حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا شرک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس پر صحابہ کرامؓ کی پریشانی دور ہوئی کہ ایمان کی قبولیت کے لئے جس ظلم سے مکمل گریز کو شرط کے طور پر پیش کیا گیا، وہ عام ظلم نہیں بلکہ شرک ہے۔

اب قرآنِ کریم میں عام طور پر بولا جانے والا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مخاطب صحابہ کرامؓ سب کے سب عرب ہیں مگر انہیں لفظ کی مراد سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور وہ اس وقت قرآن کریم کا مقصد پا سکے جب جناب رسول ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

③ اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے جو حافظ ابن کثیرؒ نے سورۃ النساء کی آیت ۱۲۳ کے ضمن میں بیان کیا ہے، اس آیت میں ایک جملہ ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْءًا يُّجْزَ بِهِ﴾ جس نے برائی کا کوئی کام کیا اسے ضرور سزا دی جائے گی'' یہاں سوءا نکرہ ہے جس میں برائی کا معمولی سا کام بھی شامل ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت صحابہ کرامؓ کو سنائی تو مجلس میں حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی موجود تھے، یہ جملہ سنتے ہی ان کی حالت متغیر ہو گئی اور چہرے کا رنگ بدل گیا حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ نے ان کی کیفیت کو محسوس کر کے پوچھا کہ «مالك يا ابا بکرؓ» آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت سن کر میری تو کمر ٹوٹ گئی ہے کیونکہ جب ہر چھوٹے بڑے کام پر قیامت کے روز گرفت ہو گی تو کون شخص وہاں کے عذاب سے بچ سکے گا؟ جناب نبی اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا کہ

نہیں آپ نے "یُجْزَ بِہٖ" کا معنی یہ سمجھا ہے کہ ہر عمل کا بدلہ قیامت کے روز ہی ملے گا، یہ درست نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی اہل ایمان کو جو تکالیف اور پریشانیاں پیش آتی ہیں، وہ ان کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں حتیٰ کہ کسی مؤمن کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے تو وہ بھی کسی گناہ کا کفارہ بن گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کی جان میں جان آئی کہ جو بات وہ سمجھے تھے، وہ صحیح نہیں تھی۔

اب حضرت ابوبکرؓ نسلی عرب ہیں، ان کی مادری زبان عربی ہے بلکہ انہیں 'اعلم الصحابہ' کہا جاتا ہے مگر قرآنِ کریم کی ایک آیتِ کریمہ کا مفہوم نہیں سمجھ پائے اور نبی اکرم ﷺ نے وضاحت کی تو بات ان کی سمجھ میں آئی ہے۔

## قرآن فہمی میں آثارِ صحابہؓ کی ضرورت اورشانِ نزول کی اہمیت

① بلکہ میں تو اس سے اگلی بات کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سنت تو قرآن فہمی کی بنیاد ہے ہی، لیکن حضرات صحابہ کرام ﷺ کے ارشادات وتشریحات سے بھی ہم بے نیاز نہیں رہ سکتے اور بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے ارشادات سامنے نہ ہوں تو قرآنِ کریم کے ارشادات کا مصداق متعین کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور اس سلسلہ میں بھی دو واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۵ میں اہل ایمان سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدہ:۱۰۵)

"اے ایمان والو! تم پر اپنا فکر لازم ہے۔ جب تم خود راہ راست پر ہو گے تو کسی دوسرے کی گمراہی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تم سب کی اللہ ہی کی طرف بازگشت ہے وہ تمہیں بتلا دے گا جو تم کیا کرتے تھے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مذکور حافظ ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے دورِ خلافت میں اسی آیت کریمہ کا مفہوم ومصداق بیان کرنا پڑا جس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ کسی

نے اس دور کے حالات پر یہ آیت پڑھ دی ہوگی اور آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ حضرت ابوبکرؓ کو منکرین ختم نبوت، زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف جس طرح محاذ آرا ہونا پڑا تھا، اس پس منظر میں کسی نے یہ آیت پڑھ دی ہو تو عام حلقوں میں اس کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے؟ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے برسرِعام اس کا اعلان فرمایا کہ اس آیتِ کریمہ میں خطاب ہم لوگوں سے نہیں ہے بلکہ اس دور کے مسلمانوں سے ہے جب فتنے عام ہو جائیں گے اور عقائد و ایمان کے فتنوں کی اس قدر کثرت ہو جائے گی کہ ایمان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی زمانے کے لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ جب اپنا ایمان بچانا بھی مشکل ہو جائے تو دوسروں کی فکر کرنے کی بجائے اپنی فکر کرو اور اپنے ایمان کو بچانے کی کوشش کرو!!

حضرت صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت کے حالات، ان کی جنگوں اور اس آیتِ کریمہ کے حوالہ سے ان کی وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے ذرا غور کر لیں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ آیتِ کریمہ کا یہ مصداق واضح نہ کرتے تو منکرین ختم نبوت، منکرین زکوٰۃ اور دیگر مرتدین کے خلاف ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کی حیثیت محلِ نظر ہو جاتی ہے بلکہ جس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے حضرت صدیق اکبرؓ نے وضاحت فرمائی ہے، وہ باقی رہ جاتی تو 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کا پورا دینی شعبہ ہی کالعدم ہو کر رہ جاتا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کا مفہوم طے کرتے ہوئے اس دور کا پس منظر اور حضرات صحابہ کرامؓ کی تشریحات کو بھی سامنے رکھا جائے، ورنہ قرآنِ کریم کی مراد تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

② اسی طرح امام ترمذیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ رومیوں کے خلاف معرکوں کے دوران ایک جنگ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی شریک تھے، مسلمانوں اور رومیوں کے لشکر آمنے سامنے تھے اور لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی کہ مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک پرجوش نوجوان نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا اور اکیلا ہی دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ اس پر لوگوں نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں باتیں کیں کہ اس نے جلد بازی کی، جذباتی کام کیا ہے اور غلطی کی ہے اسی دوران کسی صاحب نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۵ کا ایک جملہ پڑھ دیا ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرہ:۱۹۵)

جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو۔''

یہ سن کر حضرت ابوایوب انصاریؓ چونکے اور موجود لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے جس مفہوم میں ان صاحب نے اسے پڑھا ہے، یہ آیت ہم انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لئے اس کا مفہوم اور مصداق ہم بہتر جانتے ہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصارِ مدینہ نے دل کھول کر ساتھ دیا اور مہاجرین کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ قریش کے ساتھ معرکہ آرائی میں بھی پوری قوت کے ساتھ شریک رہے۔ بدر، اُحد، اَحزاب اور دیگر جنگوں میں بھرپور حصہ لیا، اس دوران اپنی کھیتی باڑی کی طرف ان کی توجہ کم ہوگئی، باغات کی حالت بگڑنے لگی اور معاشی حالت خاصی متاثر ہوئی۔ ترمذیؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کہا کہ جب غزوۂ خیبر کے بعد مسلمانوں کی حالت کچھ سنبھلی اور صورتِ حال بہتر ہونے لگی تو انصارِ مدینہ میں سے کچھ حضرات نے باہم مشورہ کیا کہ اب رسول اللہ ﷺ کو ہماری اس طرح کی امداد کی ضرورت نہیں جیسی ہم اب تک کرتے آرہے ہیں اور حالات خاصے بہتر ہوگئے ہیں، اس لئے ہم اب اپنے باغات اور کھیتی باڑی کی طرف توجہ دیں اور خرچ کرنے کے معاملہ میں کچھ کمی کرلیں تاکہ اس دوران معاشی طور پر جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلاَ تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت پڑو۔''

حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ یہ اس آیت کا شانِ نزول ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد اور دفاع پر بدستور پہلے کی طرح خرچ کرتے رہو کیونکہ اگر اس میں کمی کرو گے تو کمزور ہوجاؤ گے اور جہادی قوت کمزور کرنے کا مطلب خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا ہوگا اور اس آیت کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔

اب ان دونوں واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھ لیجئے کہ قرآن کی آیاتِ کریمہ کا مطلب اور پس منظر حضراتِ صحابہ کرامؓ نے بیان کیا، تو واضح ہوا ورنہ ان کا ظاہری مفہوم کچھ اور ہے۔

## نبی کریم کے ارشاداتِ گرامی قرآن پاک کا ہی حصہ ہیں!

ان گذارشات کے بعد میں آپ حضرات کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات وتعلیمات بھی قرآن پاک ہی کا حصہ ہیں اور اس پر ایک دوواقعات عرض کروں گا:

① بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک بار کوفہ کی جامع مسجد میں درس دیتے ہوئے یہ فرمایا کہ ”جسم پر نام گدوانے والی، بال اُکھاڑنے والی اور ریتی سے رگڑ کر دانت چھوٹے کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔“ (بخاری:۴۸۸۶)

یہ اس زمانے کا فیشن تھا جیسا کہ ہر دور میں عورتوں میں رواج ہوتا ہے کہ وہ خود کو سنوارتی ہیں، آرائش وزیبائش اختیار کرتی ہیں اور پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ انہیں دیکھا جائے، اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ یہ سن کر کوفہ کی ایک خاتون اُمّ یعقوبؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئیں اور پوچھا کہ آپ نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے؟ آپؓ نے جواب دیا کہ ہاں! میں نے یہ کہا ہے۔ اس عورت نے پوچھا: کیا یہ قرآنِ کریم میں ہے؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے تو اس کا ذکر قرآنِ کریم میں ہونا چاہئے، ہمارا زمانہ ہوتا اور ہمارے جیسا کوئی مولوی ہوتا تو گھبرا جاتا کہ قرآن کریم میں تو نہیں ہے مگر وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے، پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ ہاں یہ قرآنِ کریم میں ہے۔ اُمّ یعقوبؓ نے کہا کہ قرآن کریم تو میں نے بھی سارا پڑھا ہے، اس میں کہیں یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ قرآن کی سورۃ الحشر کی آیت ۷ میں اللہ نے فرمایا ہے کہ

﴿وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷)

”رسول اللہ ﷺ تمہیں جو دیں، وہ لے لو اور جس سے روکیں، اس سے رک جاؤ۔“

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا فیشن کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہے۔

**’نمائندہ‘ کسے کہتے ہیں؟** اس سے قطع نظر بھی یہ بات سوچ لیں کہ نمائندہ کسے کہتے ہیں؟ نمائندگی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نمائندہ جو بات بھی کہتا ہے، وہ اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اس

کی طرف سے ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے۔ ہم خود بھی اگر کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجتے ہیں اور اس کی بات توجہ سے نہیں سنی جاتی تو شکایت ہمیں ہوتی ہے کہ فلاں صاحب نے ہمارے نمائندے کی بات پر توجہ نہیں دی اور اس کو نمائندہ کی بجائے اپنی توہین سمجھتے ہیں اور رسول کا معنی ہی قاصد اور نمائندہ کے ہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ اُصولی طور پر یہ بات فرما رہے ہیں کہ محمد ﷺ میرے نمائندہ ہیں، یہ جس کام کا کہیں وہ کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔ تو اس اُصول کے تحت جناب نبی اکرم ﷺ کے تمام تر ارشادات وفرمودات اللہ تعالیٰ ہی کے ارشادات قرار پاتے ہیں۔ میں آپ حضرات کے سامنے ایک اور مثال پیش کرنا چاہوں گا:

آپ کے ضلع کا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے جو صوبائی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ جو حکم بھی دیتا ہے، وہ صوبائی حکومت کی طرف سے تصور ہوتا ہے، آج تک کسی شخص نے کسی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا کر یہ یہ سوال نہیں کیا کہ آپ نے جو حکم جاری کیا ہے، اس پر صوبائی حکومت کی تصدیق دکھائیں اور اگر کسی کو شوق ہو تو وہ ڈپٹی کمشنر کے کسی حکم پر اس سے یہ سوال کر کے دیکھ لیں، جواب خود معلوم ہو جائے گا!!

② حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کا ایک اور ارشاد اسی آیت کے ضمن میں تفسیر قرطبی میں بھی مذکور ہے کہ ایک دفعہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مرد کو دیکھا کہ وہ احرام کی دو چادروں کے ساتھ کوئی سلا ہوا کپڑا بھی پہنے ہوئے تھا۔ آپ نے اسے روک کر بتایا کہ مرد کے لئے اِحرام کی حالت میں سلا ہوا کپڑا پہننا منع ہے۔ اس نے جھٹ سے سوال کر دیا کہ کیا یہ قرآنِ کریم میں ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہاں قرآن کریم میں ہے اور پھر مذکورہ بالا آیت پڑھ کر یہی استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا نبیؐ جس کام کا حکم دے، وہ کرو اور جس سے روکے، اس سے رک جاؤ۔ اور جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مرد کے لئے حالتِ احرام میں سلا ہوا کپڑا پہننا درست نہیں ہے۔

③ اور حضرت امام شافعیؒ تو اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ گئے ہیں، تفسیر قرطبی میں اسی آیت کے ضمن میں مذکور ہے کہ حضرت امام محمد بن ادریس شافعیؒ نے کسی روز اپنی محفل میں یہ فرما دیا کہ آج جو مسئلہ پوچھو گے، قرآنِ کریم کی روشنی میں بیان کروں گا۔ ایک صاحب نے

سوال کیا کہ کیا حالتِ احرام میں بھڑیں مارنا درست ہے؟ جواب دیا کہ ہاں درست ہے! کسی نے سوال کیا کہ قرآنِ کریم میں کہاں ہے؟ حضرت امام شافعیؒ نے سورۃ الحشر کی مذکورہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ میرا رسول جس کام کے کرنے کا حکم دے، وہ کرو اور جس سے روکے، اس سے رک جاؤ جبکہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

«اقتدوا باللذين من بعدي أبي بكر وعمر» (تفسیر قرطبی: ج۱۸ ص ۱۷، ۱۸)

''میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کی اقتدا کرنا اور عمرؓ بن خطاب نے بھڑوں کو مارنے کا حکم دیا ہے۔''

④ اور حالتِ احرام میں بھڑ کو مارنے کا یہ سوال خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ سے کیا گیا تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ جائز ہے۔ تو حضرت عمرؓ کا یہ حکم سنتِ نبویؐ کا حصہ ہے اور ارشادِ نبویؐ قرآنی تعلیمات کا حصہ ہے، اس لئے یہ مسئلہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔

اس استدلال پر ایک بار پھر غور فرما لیجئے۔ یہ میرا استدلال نہیں ہے، بلکہ امام اہل سنت حضرت امام شافعیؒ استدلال کر رہے ہیں۔ اس لئے جہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے سنتِ نبویؐ اور صحابہ کرامؓ (کی آراء) کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآنِ کریم کی کئی آیات کے صحیح مصداق تک پہنچنا مشکل ہے، وہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشادات و فرمودات اور خلفاے راشدینؓ کے فیصلے بھی قرآنی تعلیمات کا حصہ ہیں اور انہیں قرآنِ کریم سے الگ کرنا درست نہیں ہے۔

حضرات محترم! میں نے آپ کے سامنے قرآن و سنت کے باہمی تعلق اور قرآن فہمی کے چند بنیادی اُصولوں پر کچھ گذارشات پیش کی ہیں، دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن و سنت کا صحیح فہم نصیب فرمائیں اور ان پر عمل کی توفیق سے بھی نوازیں۔

❀ ❀ ❀

---

☆ پندرہ روزہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ کے مدیر اعلیٰ کا یہ مضمون 'الشریعہ' کے ۱۶ رمئی ۱۹۹۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ڈیرہ اسمٰعیل خاں کی جامع مسجد دارالعلوم نعمانیہ میں مؤرخہ ۴ رمئی ۱۹۹۹ء کو آپ کے درسِ قرآن سے ترتیب دیا گیا ہے۔ (مرتب)

# تفسیر قرآن کا اہم ذریعہ؛ حدیث یا لغت؟

خطاب: شیخ محمد ناصرالدین البانیؒ ترجمہ: حافظ حسن مدنی

اللہ جل شانہٗ کا کلام بہترین کلام ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ کا راستہ بھی سب سے بہترین راستہ ہے۔ جبکہ دین میں بدعات کا ارتکاب سب سے بُرا کام ہے۔

آج جس موضوع پر میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق بدعات ہی کی قبیل میں سے ایک بدعت کے ساتھ ہے۔ میری نظر سے چند ایسی تالیفات گزری ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''قرآنِ حکیم کی 'تبیین' میں 'سنت' کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ لہٰذا میں اللہ کے فرمان ﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی علمی بساط کے مطابق اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالوں گا۔

ہم میں سے ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ قرآنِ حکیم دین اسلام کا دستور ہے جسے نبی اکرم ﷺ کے دل پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی صورت میں نازل فرمایا۔ ان سے بہتر اس کے متن اور مفہوم کو اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن تھوڑی بہت عربی زبان سے واقفیت رکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے جس نے قرآنِ حکیم کی تفسیر کے سلسلہ میں اپنی عقلوں اور خواہشات کے مطابق ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ کی تفسیر کے چند اُصول اپنے پاس سے گھڑ لئے ہیں، اور ان کی ترویج کے لئے صبح و شام مصروفِ عمل ہیں۔ صورت حال یہاں تک خراب ہوگئی ہے کہ اگر ان کا انسداد علمی استدلال کے ساتھ نہ کیا گیا تو بہت سے کم علم لوگوں کے اس فتنہ کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔ نصف صدی سے پہلے یہ فتنہ برپا کرنے والے اپنے آپ کو قرآنیین کے نام سے منسوب کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام کی مکمل تعلیم صرف اور صرف قرآن حکیم ہی ہے۔

## فکرِ جدید یا فتنۂ نو؟

چراغ سے چراغ جلنے کے مصداق مذکورہ فتنہ نے 'فکرِ جدید' کے نام سے ایک نئے فتنہ کو پیدا کیا ہے جس کے علمبرداروں کا یہ دعویٰ تو نہیں کہ اسلام صرف اور صرف قرآن حکیم ہی ہے بلکہ بظاہر وہ قرآن وسنت دونوں ہی کی دعوت دیتے ہیں لیکن جوں ہی آپ بنظر غائر ان کی تحریریں پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی آڑ میں ان کی خواہشات اور اُصول 'سنت' سے انحراف کی بناوٹی اساس پر مبنی ہیں۔ ان کے مقاصد اور اول الذکر کے مقاصد ملتے جلتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اوّل الذکر (اہل قرآن) اپنی اس نئی رائے کا کھلے عام خود اعتراف اور اعلان کرتے ہیں جبکہ یہ حضرات زیادہ عالمانہ بھیس دھار کر لوگوں کو آہستہ آہستہ اپنا ہم خیال بناتے ہیں۔

میری کوشش ہوگی کہ میں اس لیکچر میں ان کے اس طریقہ واردات کے تمام پہلوؤں سے آپ کو آگاہ کروں اور آپ کو اس بات کا احساس دلاؤں کہ 'اہمیتِ سنت' کو مجروح کرنے والے اس گروہ کی علمی سطح پر تردید کتنی اہمیت کی حامل ہے!!

## تبیینِ قرآن اور نبی اکرم ﷺ

یوں تو قرآنِ حکیم کی بہت سی آیات سے کتاب وسنت کے باہمی ربط وتعلق کو علما اپنے خطبات میں ثابت کرتے ہیں۔ لیکن میں آپ کے سامنے اس آیت کو پیش کروں گا جس میں اس بات کی صریح نص ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر قرآن نازل کیا گیا اور آپ کو اس کی وضاحت کا مکلّف بنایا گیا۔ ارشاد ہے:

﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

''اور ہم نے آپ پر ذکر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں پر اس کی وضاحت کریں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے۔''

اس آیت میں جس 'بیان' کا ذکر ہوا ہے، وہ دراصل سنتِ مطہرہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کے لئے اہل عرب کی زبان دانی کو معیار نہیں بنایا باوجود اس کے

کہ وہ انتہائی فصیح اللسان تھے۔ جبکہ ایسے عجمی جنہوں نے عرب میں چند دن ہی گزارے یا عربی زبان سیکھ لی، ان کے تبحر علم کو 'وضاحتِ قرآن' کے لئے کیسے قابل اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ عصر حاضر میں اس دور سے زیادہ 'بیانِ قرآن' کی ضرورت ہے۔

آیتِ مذکورہ میں 'مَا نُزِّلَ' سے مراد وہ وحی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کے دل پر اِلقا فرمایا اور اسے اللہ تعالیٰ نے متلو اور متعبّد بنایا ہے جس کا ماحصل قرآنِ کریم ہے۔ علاوہ ازیں ایک وہ وحی ہے جو قرآنِ حکیم کی طرح پڑھی تو نہیں جاتی لیکن اس کی حفاظت ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر قرآن حکیم کے مکمل فہم کی کوئی صورت ہی نہیں۔

لہٰذا وہ وحی جو قرآنِ مجید کی صحیح وضاحت کرتی ہے، ایک اعتبار سے قرآن پاک ہی کہلائے گی اور یہی وہ وضاحت ہے جس کا نبی اکرم ﷺ کو اس آیت میں صریحاً مکلّف بنایا گیا ہے۔

## وحی غیر متلو (احادیث) کے بغیر وضاحتِ قرآن

میرا دعویٰ ہے کہ چاہے کوئی عربی کا بہت بڑا ماہر ہو یا فہم وادراک میں یکتا، ماہر لسانیات ہو یا وضاحت وتشریح کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک۔ وحی غیر متلو (سنتِ مطہرہ) کے بغیر قرآنِ مجید کے اصل مفہوم کو مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔

نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے زیادہ اور کون ہے جو عربی اور لغت عربی کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ ان کی مادری زبان عربی میں ہی قرآن حکیم نازل ہوا، پھر بھی کئی آیات کے مطالب کو سمجھنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا۔ مجبوراً انہیں سمجھنے کے لئے نبی اکرم ﷺ سے ہی رجوع کرنا پڑا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں، امام احمدؒ نے اپنی مسند میں عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اللہ عزوجل کا یہ فرمان تلاوت فرمایا:

﴿اَلَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوٓا إِيْمٰنَهُم بِظُلْمٍ أُولٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، انہی لوگوں کے لئے امن ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔'' (انعام:۸۲)

تو صحابہ کرامؓ پر دوسری اور بھی بہت سی آیات کی طرح یہ آیت بھی گراں گزری۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس آیت کے لفظی معنی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس لئے کہ اس میں جو شدید حکم تھا، اس کی صحیح نوعیت سمجھنے میں انہیں دقت پیش آئی۔

انہوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے کون ہے جو ظلم نہیں کرتا؟ درحقیقت وہ آیت میں مذکور 'ظلم' کا مطلب وہ سمجھے جو عمومی طور پر ہر ایک سے سرزد ہوجاتا ہے مثلاً اپنے نفس پر ظلم یا اپنے کسی ساتھی یا گھر والوں پر ظلم کر گزرنا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے ان پر واضح کرتے ہوئے فرمایا: اس آیت میں لفظ 'ظلم' کا مفہوم جو تمہاری عقلیں سمجھ رہی ہیں، وہ نہیں بلکہ یہاں ظلم سے مراد 'ظلم اکبر' یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے انہیں حضرت لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو دی ہوئی نصیحت یاد دلائی:

﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمان:۱۳)

''اے میرے بیٹے! تو اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا، بلاشبہ شرک بہت بھاری ظلم ہے۔''

غور فرمایئے، جب نبی اکرم ﷺ کے صحابہ جو افصح العرب تھے، ان کے لئے مذکورہ آیت کے ایک لفظ 'ظلم' کے صحیح مفہوم کو سمجھنا مشکل ہوگیا، اور اس مشکل کو نبی اکرم ﷺ کی وضاحت نے دور فرمایا تو پھر اور کس کی مجال ہوسکتی ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر یا وضاحت کا حق اپنے پاس سے ادا کرسکے۔

یہی وہ خصوصی شانِ نبویؐ ہے، جس کا اشارہ اللہ تعالیٰ اپنے اس ارشاد میں فرماتے ہیں:

﴿وَاَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

''اور ہم نے آپؐ پر ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں پر اس کی وضاحت کریں جو ہم نے آپؐ کی طرف بھیجا ہے۔''

قرآنِ کریم کی اس واضح نص اور مذکورہ دلیل کو سننے یا جاننے کے بعد ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ذہنوں میں اس حقیقت کو بٹھالیں اور اپنے عقائد میں اس نص قرآنی کو شامل کرلیں کہ 'سنتِ مطہرہ' کے بغیر کسی کو قرآنِ حکیم کی تفسیر کا حق ہی نہیں اور نہ ہی کوئی اس کی مدد کے بغیر آیاتِ الٰہیہ کے صحیح مفہوم کو ادا کرسکتا ہے۔

## نبی کریم ﷺ کا اعلان

یہ وہ عہد ہے جس کا اعلان خاتم النّبیین رحمت للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک لاکھ چوبیس یا تیس ہزار صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں فرمایا:

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِي

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور وہ ہیں: کتاب اللہ اور میری سنت۔'' (مؤطا: کتاب القدر، رقم الحدیث:۳)

مزید ارشاد فرمایا: « وَلَنْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ

''اور یہ دونوں علیحدہ نہیں ہوں گی یہاں تک کہ حوضِ کوثر میں مجھ پر پیش ہوں۔''

اس اعلانِ نبوی ﷺ سے واضح ہے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں نہ کہ ایک چیز۔ دو وحییں نہ کہ ایک وحی۔ ''ہرگز گمراہ نہ ہوگے، جب تک ان دونوں کتاب اللہ اور میری سنت کو پکڑے رکھو گے۔'' جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس جماعت نے بھی صرف کتاب اللہ کو پکڑا وہ کتاب وسنت دونوں کی منکر ہے۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو صرف قرآن حکیم کو سنت کے بغیر یا فقط سنت کو قرآن مجید کے بغیر پکڑتا ہے، وہ یقیناً گمراہ ہے!!

صحیح ہدایت و روشنی پانے کے لئے ہمیں کتاب اللہ اور سنت دونوں کو اپنانا ہوگا۔ گمراہی سے بچنے کی شرط ہی یہی ہے کہ ہم ایک ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو تھامے رہیں۔

اس حدیث کے علاوہ اُصولِ تفسیر اور قواعدِ علومِ تفسیر میں بھی یہی تاکید ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن وسنت دونوں کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔

## قرآن کی تفسیر کیا 'صرف' قرآن سے کرنا درست ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کی تفسیر قرآن سے ہی کرنا واجب ہے جب کہ سنت کو اس کی محض تائید کے لیے پیش کیا جائے یعنی سنت کو ثانوی درجہ میں لایا جائے؟

انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ایک جماعت میں یہ غلطی پائی جاتی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کے لئے قرآنِ حکیم کو ہی کافی قرار دیتی ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں یا قصداً وہ اس حقیقت

سے گریز کرتے ہیں کہ سنت ہی قرآن کی صحیح وضاحت کرتی ہے۔ اس کے مجمل کو بیان کرتی ہے۔ اس کے عموم کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسی دوسری وضاحتیں کرتی ہے، جن سے کوئی ذی شعور مسلمان مستغنی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کی تفسیر صرف قرآنِ کریم کے ساتھ کرنا جائز نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر قرآن وسنت دونوں کے ساتھ کرنا واجب ہے۔ اسی بات کی بشارت نبی اکرم ﷺ نے گذشتہ حدیث میں دی ہے اور فرمایا: «لن يتفرقا حتى يردا عليّ الحوض» اس لئے قرآنِ حکیم کی تفسیر کرنے والے ہر شخص پر ضروری ہے کہ وہ کتاب وسنت کو جمع کرکے تفسیر کرے، خصوصاً جن آیات کا تعلق عقیدہ، احکام، اخلاق اور معاشرت سے ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ قرآن مجید کی وہ آیت (جس کی تفسیر مطلوب ہے) نبی اکرم ﷺ کی وضاحت (بیان) کی متقاضی یا حاجت مند ہو؟

## ایک ضعیف حدیث سے استدلال

اسی موضوع کے ایک اور پہلو کا ذکر ضروری سمجھتے ہوئے میں ایک حدیث کی یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں جو علم 'اُصولِ فقہ' پڑھنے والوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اسے علم اُصول فقہ میں قیاس واجتہاد کی اساس بنا کر بحث کی جاتی ہے۔ وہ حضرت معاذؓ سے مروی یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ تم پیش آمدہ مسائل میں کس چیز سے فیصلہ کرو گے۔ تو انہوں نے فرمایا: اللہ کی کتاب سے، پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر تمہیں وہاں (حل) نہ ملے تو؟ حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا: تو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے! نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر وہاں بھی تمہیں نہ ملے تو؟ تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس پر کچھ زیادتی نہ کروں گا تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لِمَا يُحِبُّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ»

''تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو اس چیز کی توفیق بخشی جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔'' (ابوداود: کتاب الاقضیۃ/ ترمذی: کتاب الاحکام)

اس حدیث کے بارے میں طلبہ علم کو پتہ ہونا چاہئے کہ علماءِ حدیث کی نظر میں یہ حدیث نہ

صریحاً صحیح ہے اور نہ تفریعاً۔ 'صریحاً' سے میرا مطلب یہ ہے کہ اکثر ائمہ محدثین نے اس کی سند ضعیف ہونے کی صراحت کی ہے جن میں امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ کے علاوہ دیگر محدثین بھی شامل ہیں۔ ضعیف قرار دینے والے ائمہ کی تعداد دس سے زائد ہے۔ ان کے متقدمین میں امام بخاری اور متاخرین میں حافظ ابن حجر عسقلانی آتے ہیں۔ ان کے مابین بھی متعدد ایسے ائمہ ہیں جن کے اقوال میں نے اپنی کتاب سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة میں درج کئے ہیں۔ تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع کیجئے۔

یہ حدیث نہ صرف ائمہ کے صریح حکم کی روشنی میں ضعیف ہے، بلکہ ان کے قواعد علم حدیث بھی اس کے ضعف پر دال ہیں۔ کیونکہ اس حدیث کا مدار جس شخص پر ہے وہ جانا پہچانا مجہول راوی ہے۔ اس سے روایت کرنا بھی معروف نہیں، چہ جائیکہ وہ عادل اور ثقہ ہو یا حفظ کے معیار پر پورا اُترے۔ ہر اعتبار سے یہ راوی 'مجہول العین' ہے۔ عظیم ناقد امام حافظ ذہبی دمشقی نے اپنی مایہ ناز تصنیف 'میزان الاعتدال فی نقد الرجال' میں اس کی جہالت کی دلائل کے ساتھ صراحت کی ہے۔

محدثین کے ہاں صریحاً اور تفریعاً ضعیف ثابت ہونے کے بعد اگر آپ اس حدیث کے متن پر بھی غور کریں تو یہ باعتبارِ متن بھی 'منکر' حدیث ہے۔ اس کے ضعف کے لئے سابقہ سطور ہی کافی ہیں جن میں صراحتاً کہا گیا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں کتاب وسنت دونوں کی جانب رجوع واجب ہے جبکہ اس حدیث میں سنت کو قرآن کے بعد مقام دیا گیا اور سنت کے بعد رائے کو یہ مقام دیا گیا ہے۔

اس حدیث کے ضعف کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ کا ارشاد ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾ (المائدة:۳) ''تم پر مردار اور خون حرام کیا گیا ہے۔''

اس آیت کی تفسیر اگر ایسے شخص سے پوچھی جائے جو معاذ بن جبلؓ کی مجہول حدیث میں بیان کردہ 'ترتیبِ تفقہ' کا قائل ہو تو وہ قرآنِ حکیم کی اس آیت پر غور وفکر کرنے کے بعد اس کے صریح معنوں کو اس طرح بیان کرے گا کہ: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾ ''تمہارے لئے مردار اور خون حرام ہے۔'' اس آیت کے واضح معانی کی روشنی میں وہ کہے گا کہ 'مچھلی' حرام ہے، اس طرح جگر اور تلی کے بارے میں بھی اس کا جواب یہی ہوگا کیونکہ اس

آیت میں مردار اور خون کا حکم ایک ہی ہے جب کہ تلی اور جگر بھی محض خون ہی ہوتے ہیں۔

جبکہ یہ بات درست نہیں، اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ صرف آیتِ قرآنی کے صریح معانی پر اعتماد کرتے ہوئے مسئلہ بتانا جائز نہیں بلکہ اس کے ساتھ حدیث کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ قرآن اور بیان (حدیث) دونوں لازم وملزوم ہیں۔ یعنی قرآن وسنت دونوں کا ہی نام 'اسلام' ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بیان کے ذمہ دار (نبی اکرم ﷺ) نے اس آیت کی وضاحت کس طرح کی ہے۔ تو معلوم ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کی اس بارے میں ایک حدیث ہے، باوجود اس کے کہ اس حدیث کی سند میں کچھ کلام ہے لیکن ابن عمر سے موقوفاً یہ قول بہر حال صحیح ثابت ہے جو بعض علما کے نزدیک حدیثِ 'مرفوع' کے حکم میں ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أُحِلَّتْ لَنَا الْمَيْتَتَانِ وَالدَّمَانِ...... اَلْحوْتُ وَالجَرادُ والْكَبِدُ وَالطِّحَالُ»

''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں۔ دو مردار سے مراد مچھلی اور ٹڈی (پرندہ) ہے جب کہ دو خونوں سے مراد جگر اور تلی ہیں۔'' (ابوداود: کتاب الاطعمہ/ابن ماجہ: کتاب الاطعمہ)

اس حدیث میں بعض مردار اور خون جائز ہونے کی صراحت موجود ہے۔

اس طرح ایک اور صحیح حدیث میں وارد ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا:

''نبی اکرم ﷺ نے عبیدہ بن جراح کو ایک لشکر کا امیر بنا کر روانہ کیا۔ یہ لوگ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ان کا زادِ راہ صرف کھجوریں تھیں۔ کھجوریں کم پڑتے پڑتے ہر شخص کو ایک ایک کھجور دینے کی نوبت آ گئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے دور سے ساحل سمندر پر ایک بڑی شئے دیکھی۔ جب اس کے پاس گئے تو معلوم ہوا یہ ایک بہت بڑی اور موٹی مچھلی ہے۔ اُنہوں نے اس مچھلی سے سیر ہو کر کھایا اور باقی ہمراہ لے لیا۔ اس مچھلی کی جسامت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس کی ایک پسلی کی ہڈی زمین میں گاڑی تو اس کے نیچے ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر آسانی سے نکل سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اسے سمندر کے باہر پھینک دیا اور اسے اَصحاب النبی ﷺ کے لئے میسر فرما دیا۔ جب یہ لوگ نبی ﷺ کے پاس واپس پہنچے تو نبی ﷺ نے ان سے سوال کیا: ''تمہارے پاس اس مچھلی میں کچھ میرے کھانے کیلئے بھی ہے؟''

حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سمندر کا مردار حلال ہے۔ لیکن یہ

اسی کے لئے حلال ہوگا جو قرآن کے ساتھ ساتھ سنت پر بھی اعتماد کرتا ہوگا۔ لیکن جو قُرانیین (اہل قرآن) سے متاثر ہوگا تو اس کا جواب یہ ہوگا: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ﴾ "تمہارے اوپر مردار اور خون حرام ہے۔" (خواہ مچھلی ہو یا کوئی اور چیز) ایسا شخص جب قرآن حکیم کی ایسی آیت پر پہنچے گا جو بتاتی ہیں کہ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

اطاعتِ رسولؐ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ تو اس وقت اس کے لئے اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ قرآن کے ساتھ سنت کی طرف بھی رجوع کرے، اور اسے قرآن سے ملا کر سمجھے اور ان کے درمیان فرق نہ کرے۔ یہ اعتقاد رکھنے پر اس آیت کا مفہوم اس کے ذہن میں یوں آئے گا کہ "تم پر مردار حرام ہے ماسوا 'میتة البحر' کے اور خون حرام ہے ماسوا 'جگر' اور 'تلی' کے"۔ ایسا آدمی کہے گا کہ میں نے قرآن کریم کا یہ مفہوم نبی اکرم ﷺ سے سمجھا ہے جس کے بعد ہر ایک دلیل بے وزن ہے۔

## شریعت کی اساس قرآن وسنت دونوں پر قائم ہے!

شریعت کی پوری عمارت قرآن وسنت دونوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی لئے امام شافعیؒ سے یہ فرمان منقول ہے کہ مکمل سنت (بشرطیکہ وہ صحیح ہو) وہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سمجھائی۔ اس سے امام شافعیؒ کا یہ مقصد ہے کہ قرآن وسنت تسبیح کی طرح باہم پروئے ہوئے دانوں کی مانند ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنے رسول ﷺ پر ان آیات کی وضاحت اور بیان کو اُتارا، جن کی اُمت کو ضرورت تھی۔

قرآن کی تفسیر میں یہ قاعدہ بھی لازمی حیثیت رکھتا ہے کہ قرآن وسنت دونوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ بات زیبا نہیں کہ ہم مرحلہ وار یہ کہیں کہ پہلے مرحلے پر قرآن پھر دوسرے مرحلے پر سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیونکہ اس سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ سنت دوسرے مرتبے پر ہے!!

اس بات سے ہمارا مقصود یہ نہیں کہ سنت ہر اعتبار سے قرآن کے مساوی ہے، اور نہ ہی یہ کسی اہل علم کو لائق ہے۔ باعتبارِ ثبوت سنت کا قرآن سے دوسرا ہی درجہ ہے، کیونکہ قرآن تو

ہمیں بذریعہ تواتر ملا ہے جبکہ سنت ایسے نہیں ملی۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حکم کو ثابت کرنے کے اعتبار سے دونوں بالکل مساوی ہیں، باعتبار عمل کے سنت اور قرآن میں کوئی تفریق نہیں اور جس تفریق کو بعض علما (خصوصیت سے محدثین کرامؒ) نے ملحوظ رکھا ہے وہ باعتبارِ روایت ہے۔ جہاں تک علم درایت، فقہ اور کتاب اللہ سے مفہوم لینے کا تعلق ہے، وہاں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی حدیث کے مابین کوئی فرق نہیں!!

## خبر متواتر اور خبر احاد کی حجیت؟

یہ بحث ہمیں اس سے ملتے جلتے ایک اور مسئلے کی طرف بھی لے جاتی ہے جس کے بارے میں بعض لوگوں نے علم حدیث سے جہالت اور اُصولوں سے ناواقفیت کی بنا پر سنتِ رسول ﷺ میں شک کیا ہے۔ ان کی اس بحث کا محور خبر متواتر اور خبر آحاد کی تقسیم ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس بحث سے وہی اہل علم مستفید ہوسکتے ہیں جو علم حدیث وسنت میں تخصص رکھتے ہوں۔ جہاں تک عامۃ المسلمین کا تعلق ہے، انہیں اس تفصیل سے کوئی فائدہ نہیں۔ بلکہ یہ بحث ان کے ذہنوں میں سنتِ رسول ﷺ سے متعلق مزید تشکیک کا باعث بن سکتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ذہنی ناپختگی کی بنا پر ان شک پیدا کرنے والوں کے پیدا کردہ شبہات کا شکار ہوجائیں!!

حدیث وہ ہے جو نبی اکرم ﷺ سے صحیح طور پر مروی ہو چاہے کسی بھی طریق سے مثلاً حسن، صحیح؛ یا حسن لذاتہ وصحیح لذاتہ، یا حسن لغیرہ، وصحیح لغیرہ، صحیح غریب، صحیح مستفیض، صحیح مشہور یا صحیح متواتر ہو۔ ان اصطلاحات کو اہل علم بخوبی جانتے ہیں، عام مسلمانوں کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس پر ایمان لانا اس کی تصدیق کرنا واجب ہے یا یہ حدیث ضعیف ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔

مشاہدے میں آیا ہے کہ وہ لوگ جو عوام الناس کے سامنے ایسی تفصیلات کے بارے میں بحث کرتے ہیں جن کا تعلق اہل علم سے ہے تو اس طرح وہ عام مسلمانوں میں بے شمار ایسی صحیح احادیث کے بارے میں بھی شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو بطریق احاد مروی ہیں۔ حدیثِ احاد کا بالاختصار مطلب یہ ہے کہ جو درجہ تواتر کو نہ پہنچے اور متواتر سے مقصود یہ ہے

کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک بڑی تعداد (جس کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہے) نے اس حدیث کو بیان کیا ہو۔ لیکن اس تعداد کے تعین کے بارے میں بے شمار اختلاف ہیں جو میرے خیال میں اللہ کی رحمت ہے۔ کیونکہ کسی چیز میں اختلاف اس کی ناپختگی پر تو دلالت کرتا ہے، صداقت پر نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تواتر کی تعداد کم از کم سو شخص ہیں جبکہ بعض اس سے کچھ کم بتاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض نے کم از کم دس عدد بیان کئے ہیں۔ یعنی جب تک کوئی حدیث سو راویوں تک (اعلیٰ قول کا اعتبار کرتے ہوئے) یا باعتبارِ ادنیٰ قول کم از کم دس راویوں سے مروی نہ ہو اور اسی طرح ۱۰۰ یا دس صحابہ سے لے کر تابعین تک حتیٰ کہ کتبِ حدیث تک مُتصلا سو یا دس رواۃ سے اسے بیان نہ کیا ہو، وہ درجہ تواتر کو نہیں پہنچ سکے گی۔

حدیث کے متواتر یا غیر متواتر ہونے سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ خبر آحاد (غیر متواتر) سے غیبیات (جس کی تعبیر وہ عقائد سے کرتے ہیں) کے بارے میں حکم اخذ کرنا صحیح نہیں۔ احکام کے علاوہ غیر متواتر حدیث سے کوئی اور مسئلہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ خیال ان لوگوں کا ہے جو مذکورہ بحث کو اپنا موضوعِ سخن بنا کر احادیث کے بارے میں خلافِ حقیقت غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ہر فریب کی وضاحت اور تردید تو چند علماءِ حدیث ہی کر سکتے ہیں جو ہر زمانے میں بڑے کم ہوتے ہیں۔

اس کی مثال ملاحظہ فرمائیں کہ علماء حدیث کے نزدیک حدیثِ متواتر کی واضح ترین مثال نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» حدیث متواتر ہے کیونکہ اس کے راوی صحابہ کرامؓ سے لے کر تا حدِ آخر سو تک موجود ہیں۔ لیکن جسے 'حدیثِ متواتر' اپنی تمام شرائط کے ساتھ پہنچ گئی اس کے لئے تو وہ حدیث متواتر ہے...... لیکن اگر میں اکیلا یہ کہہ دوں کہ یہ حدیث متواتر ہے تو کیا میرے اکیلے کی آپ کے سامنے روایت کرنے کی بنا پر اس کا تواتر ختم ہو جائے گا؟

بہتر یہی ہے کہ ہم ایسی بحثوں میں نہ پڑیں اور احادیث کی اسی طرح اتباع کریں جس طرح ہمارے اسلاف نے کی ہے۔ عوام الناس کو تو ان بحثوں میں اُلجھانا فلسفے کی بحثوں کی طرح اُنہیں مشکلات کا شکار کر دے گا۔ صاف بات یہ ہے کہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے

تواتر کی شرط لگانا حدیثِ نبوی ﷺ کو معطل کرنے کی مذموم کوشش ہے۔

دورِ حاضر میں اکثر افراد اور جماعتوں کو میں نے اس مرض میں مبتلا پایا ہے کہ وہ بے شمار صحیح احادیث کو اس دلیل سے ردّ کردیتے ہیں کہ جی! فلاں حدیث احکام کے بارے میں نہیں بلکہ امورِ غیب اور عقائد سے متعلق ہے لٰہذا یہاں حدیثِ احاد معتبر نہیں! اسی طرح یہ افراد متعدد احادیث کو اپنی خواہشات کے مطابق ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔

## خیرالقرون میں لوگوں کا طریقہ

ان تمام مباحث میں پڑنے اور ذہنی خلفشار سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم عہد اوّل (قرونِ اولیٰ) نبی اکرم ﷺ کے زمانہ کی طرف رجوع کریں۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ اصحاب النبیؐ اپنے اور بعد میں آنے والے لوگوں کو جو اُن کے ہم عصر تھے مگر نبی اکرم ﷺ سے انہیں شرفِ ملاقات نہیں ہوسکتا، احادیث کیسے بیان کرتے تھے، مثلاً اہل یمن کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کرسکے مگر نبی اکرم ﷺ وقفہ وقفہ سے معاذ بن جبلؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بھیجتے رہے۔ معاذ بن جبلؓ کو بھیجتے وقت اسلام کی دعوت دینے کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَوَّلَ مَاتَدْعُوْھُمْ اِلَیْهِ شَھَادَةُ اَنْ لاَّ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَاِذَا ھُمْ أَجَابُوْكَ فَاْمُرْھُمْ بِالصَّلٰوۃِ» (صحیح بخاری:۱۵۸/۲)

''سب سے پہلے انہیں کلمہ توحید کی دعوت دو اور اگر وہ کلمہ شہادت کا اقرار کرلیں تو انہیں نماز کی دعوت دو۔''

محل شاہد یہ ہے کہ نماز تو دیگر احکام کی طرح ایک حکم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے پہلے عقیدۂ توحید کی طرف دعوت کا بھی ذکر ہے جو اسلام کے تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے انہیں تبلیغ کا حکم دیا تھا اور انہوں نے تبلیغ کی تو سامعین پر حجت قائم ہوگئی یا نہیں؟ وہ لوگ جنہوں نے اسلام میں یہ فلسفہ (کہ خبر احاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا) داخل کیا ہے، ان کے زعم میں تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے

حجت قائم نہیں ہوتی بلکہ رسول اللہ ﷺ پر لازم تھا کہ کم از کم اتنی تعداد بھیجتے جو کہ 'عددِ تواتر کے معیار پر پوری اُترے!!''

اسی لئے میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو جن کا یہ عقیدہ ہے کہ خبر آحاد سے عقائد ثابت نہیں ہوتے، کہا کرتا ہوں کہ تم میں سے کسی مبلغ کو اسلام کی تبلیغ کے لئے 'بلادِ کفر' کی طرف جانے کا کبھی اتفاق ہو تو لازمی بات ہے کہ وہ سب سے پہلے انہیں اسلامی عقائد کی طرف دعوت دے گا، اس لئے کہ اسلامی عقائد میں سب سے پہلا عقیدہ 'اللہ کی توحید اور نبی اکرم ﷺ کی رسالت کی شہادت' ہے۔ تو کیا وہ اکیلا ہی متواتر کے درجہ پر فائز ہو گا؟ اور اس کی طرف سے دیارِ کفر میں اللہ کی حجیت قائم ہو گی یا نہیں؟...... یقیناً ضرور ہو گی!

مذکورہ گروہ کے سربراہ نے اپنی کتاب میں 'دعوت کے طریقہ کار' کے بارے میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس کا نام اس نے 'طریق الایمان' رکھا ہے۔ جس میں اس نے مسلمانوں کو بلادِ اسلام میں اور کفار کو ان کے ممالک میں اسلام کی طرف دعوت دینے کا طریقہ بیان کیا ہے۔ اس طریقہ کے آخر میں یہ اُصول بھی مذکور ہے کہ خبر آحاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص تبلیغ کے لئے جائے اور ان کو اپنے سربراہ کے بیان کردہ طریق کے مطابق تبلیغ اسلام کرے لیکن جب اس طریقہ کے آخر میں یہ اُصول بھی بیان کرے اور لوگوں کا مجمع اس کا خطاب سن رہا ہو کہ خبر احاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہو گا تو ان لوگوں میں سے ایک شخص کھڑا ہو اور کہے: محترم! آپ نے ابھی ابھی ہمارے سامنے اسلامی عقیدہ رکھا ہے اور آخر میں آپ نے اپنا اُصول بھی بتایا ہے، اس کی روشنی میں آپ بھی ہمیں اسلام کا عقیدہ سکھانے کے لئے اکیلے آئے ہیں لہٰذا آپ ہی کے بیان کردہ منہج پر جو آپ نے ہمیں سکھایا ہے، اللہ کی حجت ہم پر قائم نہیں ہوئی کیونکہ آپ فردِ واحد ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنے وطن واپس جائیں اور اپنے ساتھ اتنی تعداد لے کر آئیں جو آپ کے ساتھ گواہی دے کہ جو آپ نے ہمیں سکھایا ہے وہ اسلام ہی ہے!!

تعجب ہے کہ یہ لوگ اس حدیث پر توجہ نہیں دیتے جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے یعنی نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو فرداً فرداً بھیجا تاکہ انہیں

اسلام کی تعلیم دیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس چیز کو ان لوگوں نے اسلام میں داخل کر دیا ہے، سلف صالحین کا اس تقسیم (کہ فلاں متواتر ہے، فلاں احاد ہے) سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ صرف اتنا کافی ہے کہ آپ کو فقط نبی اکرم ﷺ کی حدیث (صحیح کی شرائط) کے ساتھ پہنچ جائے۔ حدیث کو ان کمزور عقلوں کی شہادت اور تائید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی جو کتاب و سنت کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ المختصر، ہمارے لئے سنت کی مدد سے قرآن کی تفسیر کرنا واجب ہے، چاہے وہ متواتر ہوں یا احاد۔ یہی راستہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی رو سے ہمارے لئے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے چلنا لازم ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَاوِيْلاً﴾ (النساء:٥٩)

''اگر تمہارا کسی چیز میں جھگڑا ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر اور اچھا ہے انجام کار کے لحاظ سے۔''

یہ بات بھی ہمارے مشاہدے میں ہے کہ قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جن کی تفسیر کرنے کے لئے ہم کو کوئی حدیث نہیں ملتی۔ تب اس آیت پر عمل کرنا کیسے ممکن ہے؟

## تفسیر قرآن میں اقوالِ صحابہؓ وتابعینؒ کی اہمیت

اہل علم کے ہاں معروف ہے کہ ایسی صورت میں جب سنت میں ہمیں قرآنی آیات کی تفسیر کی راہنمائی نہ ملے تو پھر سلف صالحین کی تفسیر کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ جن میں سب سے پہلے صحابہ کرامؓ آتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ ان کا نبی اکرم ﷺ سے زیادہ ساتھ رہا اور دوسری وجہ ان کا قرآن کے بارے میں بکثرت سوالات کرنا اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کرنا ہے۔ دوسرے درجہ میں عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ ابن مسعودؓ سے ابن عباسؓ کے بارے میں یہ بات مروی ہے کہ بلاشبہ وہ قرآن کے ترجمان ہیں۔

جب سنت میں ہمیں کتاب اللہ کی تفسیر نہ ملے تو درجہ بدرجہ اصحابِ رسولؐ کی تفاسیر سے مدد لیں گے۔ جن میں اوّلین حیثیت کے حامل ابن مسعودؓ، پھر ابن عباسؓ ہیں۔ پھر اس کے بعد

جس صحابی سے بھی کسی آیت کی تفسیر منقول ہو اور اگر صحابہؓ سے تفسیر نہ ملے تو پھر تابعینؒ کی تفاسیر سے مدد لینا لازمی ہے۔ بالخصوص وہ تابعی جنہوں نے اصحاب الرسول سے تفسیر سیکھنے کا اہتمام کیا مثلاً سعید بن جبیرؒ، طاؤسؒ اور انہی جیسے دیگر تابعین جو صحابہ، خصوصاً ابن عباسؓ سے حصولِ تفسیر میں مشہور ہیں۔

## تفسیر بالرائے

اسی طرح بعض آیات کی تفسیر رائے سے بھی کی جاتی ہے جبکہ ان کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے متّصلاً کوئی وضاحت ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن بعض متاخرین نے اس گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آیات کی تفسیر اپنے مذاہب کے مطابق کرنی شروع کردی ہے۔ یہ انتہائی خطرناک اقدام تھا کہ اپنے مذاہب کو تقویت دینے کیلئے آیات کی تفسیر ان کے تابع کی جائے۔

## خلاصۂ بحث

جب ہمارے لئے حقیقت ظاہر ہوگئی ہے کہ احادیث جو کہ نبی اکرم ﷺ سے ہم تک یا تو کتبِ حدیث کے واسطہ سے پہنچی ہیں یا صحیح اسانید کے ساتھ تو ہمیں ان پر مطمئن ہوجانا چاہئے اور جن شبہات کو دورِ حاضر میں پیش کیا جاتا ہے، ان پر کان نہ دھرتے ہوئے شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اور تفسیر قرآن میں سلف صالحین کے منہج کو ہی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

---

☆ مسجد بنی ہاشم میں ۱۸/ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۹/دسمبر ۱۹۸۹ء، بروز جمعرات کو علامہ ناصر الدین البانی نے یہ خطاب فرمایا جسے عربی رسالہ التوعیہ، دہلی نے شائع کیا۔ اس کا ترجمہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے اپریل ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ حالیہ مضمون میں بعض مقامات پر اختصار کرتے ہوئے اسی ترجمہ کو شائع کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

# فہم قرآن کے آداب وشرائط

تحریر: مولانا رضا احمد

قرآنِ کریم کا فہم وتعلّم ایک مقدس عبادت ہے لہٰذا دیگر عبادات کی طرح اس عبادت کا حق یہ بھی ہے کہ آدمی اہتمام کے ساتھ اسے ادا کرے۔ فہم قرآن کے لئے جن آداب وشرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

**❶ نیت کی پاکیزگی:** قرآنِ کریم صحیفہ ہدایت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں ہدایت حاصل کرنے کی خواہش ودیعت کی ہے۔ اسی خواہش کے تحت طلبِ ہدایت کی نیت سے اگر قرآن کریم سے استفادہ کیا جائے تو بقدرِ کوشش اور توفیق الٰہی انسان اس سے فیض یاب ہوگا۔ جو لوگ اس کتاب کو مخصوص نظریات لے کر پڑھتے ہیں تو وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے جاتے ہیں اور قرآنی ہدایت کی اُنہیں ہوا تک بھی نہیں لگنے پاتی۔ قرآنِ کریم نے اس کی اسی صفت کو یہ کہہ کر بیان فرمایا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا﴾

''اللہ اس کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔'' (البقرۃ:۲۶)

**❷ قرآنِ کریم کو ایک برتر کتاب تسلیم کرنا:** کسی کتاب کے بارے میں اس کو سمجھنے سے پہلے ہی یہ حسن ظن قائم کر لینا کہ وہ ایک عظیم و برتر کتاب ہے، ایک عجیب بات ہے لیکن قرآنِ کریم کے بارے میں یہ حسن ظن کوئی تعجب انگیز نہیں ہے۔ کوئی شخص اس پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کرسکتا کہ جتنا بڑا انقلاب اس کتاب نے دنیا میں پیدا کیا، وہ کسی کتاب نے کبھی برپا نہیں کیا۔ قرآنِ کریم اپنی ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ اس تاریخ کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ ضروری ہے۔ اس کتاب کو ایک خاص دور کی کتاب ماننا، محض حلال وحرام کا ایک فقہی ضابطہ سمجھنا یا اسے حصولِ برکت و دافع البلیات کتاب سمجھ کر پڑھنا، اس کے فیض سے اپنے آپ کو محروم کر دینے والی بات ہے!!

**❸ قرآن کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کا عزم**

قرآنِ کریم سے صحیح استفادہ کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی اپنے آپ کو اس کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم دل میں پیدا کرے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے جہاں یہ محسوس ہو کہ میری زندگی اس کی مقرر کردہ حدود سے ہٹی ہوئی ہے یا ایک مؤمن کے لئے جو معیار اس نے پیش کیا ہے، میرا معیارِ زندگی اس سے مختلف یا اس سے فروتر ہے، تو عزم یہ ہونا چاہئے کہ میں اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کروں گا۔ صحابہؓ کا قرآن سے استفادہ کا طریقہ یہی تھا۔ بعض صحابہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے سورۂ بقرہ سے استفادہ پر آٹھ سال صرف کئے، یعنی اس کی رہنمائی کے مطابق اپنے عمل کو بھی ڈھالا۔

**❹ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دُعا:** قرآن سے استفادہ کے لئے اللہ سے ہدایت و رہنمائی عطا کرنے کی دُعا بھی کرنی چاہئے۔ اس کیلئے احادیثِ نبویؐ میں وارد دُعاؤں کا پڑھنا مفید ہے۔ مندرجہ ذیل دُعا اکثر پڑھتے رہنا چاہئے:

''اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، اِبْنُ عَبْدِكَ، اِبْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِي وَنُورَ صَدْرِي وَجِلَاءَ حُزْنِي وَذِهَابَ هَمِّي وَغَمِّي''

''اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے، مجھ پر تیرا حکم جاری ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے، میں تجھ سے تیرے ہر نام کے واسطے سے جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے کو پکارا یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج بنا دے۔''

[فکرِ اصلاحی و غامدی کا ایک تجزیہ]

# قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا کردار

ڈاکٹر محمد امین

سابقہ صفحات [ص۵۵تا۸۳] میں مولانا عبد الغفار حسن کا مضمون 'فہم قرآن کے بنیادی اُصول' شائع ہوا ہے جو نہایت وقیع، مفید اور علمی مباحث پر مشتمل ہے لیکن قرآن فہمی میں حدیث وسنت کے کردار کے حوالے سے جو کچھ مولانا نے لکھا ہے، اس کے بارے میں ہمارا حسن ظن یہ ہے کہ مولانا محترم نے غالباً یہ دیکھے بغیر کہ اس کی زَد کہاں پڑتی ہے، اپنے دیرینہ رفیق کار مولانا امین احسن اصلاحی کی وہ رائے اپنا لی ہے جس کے بارے میں ہمارے عہد کے جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ غلط ہے جبکہ بعض کے نزدیک وہ گمراہ کن، انکارِ سنت کے مترادف اور مقامِ نبوت کے استخفاف اور حدیث وسنت کی ہوا خیزی پر منتج ہوتی ہے۔ مولانا عبد الغفار حسن جیسا محدث جس کی زندگی ہی خدمتِ حدیث اور اندرون وبیرونِ ملک حدیث پڑھتے پڑھاتے گزری ہو، حدیث وسنت کے بارے میں ایسا مخدوش نقطہ نظر کیسے اپنا سکتا ہے؟ بہرحال اس بارے میں ہم مولانا اصلاحی کے نقطہ نظر کو چونکہ غلط سمجھتے ہیں لہٰذا اس کے بارے میں عرض کرتے ہیں تاکہ قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا مقام واضح ہو کر سامنے آسکے اور جس کسی کو کوئی غلط فہمی لاحق ہو وہ دور ہو جائے۔ وباللہ نستعین!

حدیث وسنت اور قرآن فہمی میں اس کے کردار کے حوالے سے مولانا اصلاحی کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ حدیث وسنت میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنّت حضور ﷺ کی عملی زندگی کی وہ تفصیل ہے جو قرآن کی طرح تواترِ عملی سے ثابت ہوتی ہے، لہٰذا قطعی

الثبوت ہے۔ وہ قرآن کی طرح اہم، اس کے قالب کے لئے مثل روح اور اسی کی طرح حجت ہے۔☆ اس کا انکار قرآن کا انکار ہے اور وہ حدیث پر مُہیمن ہے۔

حدیث ان کے نزدیک سنت کا تحریری ریکارڈ ہے جو تواتر سے ثابت نہ ہونے کی بنا پر 'خبر واحد' کا درجہ رکھتی ہے۔ ظنی الثبوت، مجموعہ رطب و یابس اور صحت کے لحاظ سے نا قابل اعتماد ہے لہٰذا فہم قرآن کے حوالے سے بنیادی اور کلی طور پر اس پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ خبر واحد سے قرآن کا نسخ جائز ہے نہ اس کے عموم کی ایسی تخصیص کی جا سکتی ہے جو قرآن اور لغت کے معروف مفاہیم کے خلاف ہو۔

قرآن کے فہم کا بنیادی انحصار، اس کی زبان، اس کے داخلی نظم اور تفسیر القرآن بالقرآن پر ہے۔ اخبارِ آحاد سے اگر اس فہم کی نفی☆ ہوتی ہو اور کسی صورت ان میں تطبیق نہ دی جا سکے تو اخبارِ آحاد کو ردّ کر دیا جائے گا۔①

حدیث و سنت اور قرآن فہمی میں اس کے کردار کے حوالے سے مولانا اصلاحی کا یہ موقف اتنے مغالطوں پر مبنی ہے اور اتنے مسائل کو جنم دیتا ہے کہ ان کی تنقیح کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ ایک مقالہ کی محدود طوالت کے پیش نظر ہم تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے بعض بنیادی باتوں پر مختصراً اپنی گزارشات پیش کریں گے۔

---

☆ نام نہاد اصلاحی حلقہ 'انکارِ سنت' کے الزام سے بچنے کے لئے سنت کو حجت تو مانتا ہے، لیکن سنت کو قرآن کی طرح 'وحی' کہنے سے گریزاں ہے حالانکہ وحی اور حجت ہونے میں فرق ہے، مثلاً انسان پر والدین کی اطاعت حجت ہے، اسلامی عدالت کا فیصلہ بھی حجت ہے لیکن یہ وحی نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی صاحب سنت کی تعریف میں نبی ﷺ کے بعد آنے والے صحابہ اور امت مسلمہ کو شامل کرتے ہیں حالانکہ صحابہ رامت مسلمہ کا عمل (ان کے بقولِ تواتر عملی) بالاتفاق وحی نہیں ہے۔ وحی تو آپ ﷺ کے وصال پر ہی منقطع ہوگئی تھی۔ (محدث)

☆ مولانا اصلاحی حدیثِ رسول کی رو سے ہر اضافے (خواہ وہ شروط و قیود ہی کی قسم سے ہو) کو اصل قرآنی مفہوم کے منافی قرار دیتے ہیں اور کسی طرح تطبیق دینے کو آمادہ نہیں جیسے قرآنی حکم ۱۰۰ کوڑے کی سزا وہ صرف کنوارے زانی کے لئے مخصوص کرنا حدیث کی رو سے صحیح نہیں سمجھتے۔ (محدث)

## حدیث وسنت میں فرق

جمہور (محدثین) اہل علم حدیث وسنت میں اس طرح فرق نہیں کرتے جس طرح مولانا اصلاحی نے کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی سنت یعنی آپؐ کی عملی زندگی اور اُمت کے لیے عملی رہنمائی صرف آپؐ کے 'اَفعال' پر مبنی نہ تھی بلکہ آپؐ کی گفتگو اور اَقوال بھی اس کا اہم حصہ تھے۔ اسی طرح کتبِ احادیث میں حضور ﷺ کے محض اَقوال ہی محفوظ نہیں کیے گئے بلکہ آپؐ کی سنت (عملی زندگی) بھی محفوظ کی گئی ہے یہاں تک کہ بہت سے مؤلفین نے اپنے مرتب کردہ احادیث کے مجموعوں کے نام ہی 'سنن' پر رکھے اور وہ 'سنن' کے نام ہی سے اہل علم میں معروف ہیں جیسے سنن ابی داود، سنن ترمذی، سنن° ابن ماجہ وغیرہ۔ اس طرح اہل علم یہ جاننے کے باوجود کہ کتبِ احادیث میں مذکور حضور ﷺ کے اقوال واعمال حضورؐ کی سنت کا ریکارڈ ہیں، بعض اوقات انہیں صرف حدیث یا صرف سنت کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ حدیث وسنت کو مترادف کے طور پر استعمال کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے ...... گو لغوی یا بعض فنون کے اعتبار سے اس میں کچھ تجاوز ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی اہم مظہر یا جزو کو تغلیباً کل سے موسوم کر دیا جاتا ہے (دیکھئے مثلاً حدیث میں أنف[۲] قرآن میں وجہ[۳] اور لغت میں نفس[۴] کا استعمال جہاں انف مظہر عزت وحرمت، وجیہ بمعنی خوبصورت ومعزز اور نفس بمعنی انسان کے استعمال ہوتا ہے حالانکہ نفس کے لغوی معنی سانس کے [بھی] ہیں لیکن سانس چونکہ سبب ومظہر زندگی ہے لہٰذا اسے حیاۃ اور ذو حیاۃ کے لیے استعمال کر لیا جاتا ہے)۔

لیکن مولانا اصلاحی نے حدیث وسنت میں فرق کرتے ہوئے یہ 'جدت' پیدا کی ہے کہ سنت کو 'تواترِ عملی' سے ثابت شدہ کہہ کر انہوں نے سر پر بٹھا لیا اور احادیث کے سارے ذخیرے کو خبر واحد، ظنی الثبوت اور مجموعہ رطب ویابس کہہ کر پیچھے پھینک دیا۔

---

° 'سنن' نام کی کتابوں میں نبیؐ کی حدیث وسنت جمع کی گئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ محدثین حدیث وسنت میں کسی فرق کے قائل نہ تھے، ورنہ وہ احادیث کے مجموعوں کے نام 'سنن' کبھی نہ رکھتے۔ انکی نظر میں حدیث اور سنت دونوں ہی نبیؐ کے اقوال، افعال اور تقریرات پر بولے جاتے ہیں۔ جو معیاری روایات کی صورت میں صرف کتب حدیث میں ہی محفوظ ہیں۔

زمینی حقائق یہ ہیں کہ سنت محض 'تواترِ عملی' سے ثابت ہی نہیں ہوتی (آئندہ صفحات میں ہم اس پر تفصیل سے کلام کریں گے) لہٰذا جس چیز کو مولانا 'سنت' کہہ رہے ہیں وہ محض ایک نظری بات ہے اور نظری لحاظ سے تو سنت کی حجیت پر ساری اُمت متفق ہے کہ اس پر تو مدارِ ایمان ہے کہ خود قرآن کی رو سے حضورؐ کی اطاعت واجب ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے انتقال فرما جانے کے بعد آپؐ کی وہ سنت کہاں ہے جس کی اطاعت کی جائے؟

اس بارے میں جمہور☆ اُمت کا موقف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جاننے کا ذریعہ وہ صحیح احادیث ہیں جو ثقہ راویوں سے مروی ہیں، اسی لیے وہ انہیں تقدس کا درجہ دیتے ہیں جب کہ منکرین حدیث اور اصلاحی صاحب ایسا نہیں سمجھتے۔ مولانا اصلاحی حدیث کو خبر واحد ،ظنی الثبوت اور مجموعہ رطب و یابس کہہ کر اسے اہمیت نہیں دیتے اور جس سنت کو وہ سر کا تاج اور مثل قرآن کہتے ہیں وہ عملاً کہیں موجود ہی نہیں۔ (راقم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ 'حدیث وسنت' کو ملا کر ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کرتا ہے [جیسے اسی مضمون کا عنوان ہے ''قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا کردار''] تاکہ اس میں دونوں الفاظ بیک وقت جمع ہو جائیں اور ابہام کا امکان ختم ہو جائے)۔

مولانا اصلاحی کی اس 'فطانت' کا فائدہ یہ ہے کہ جب ان کے تلامذہ عام مسلمانوں سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ''ہم تو قرآن کے ساتھ سنت کو بھی حجت مانتے ہیں، ہم کوئی منکرین سنت تھوڑی ہیں'' حالانکہ سنت سے ان کی مراد وہ نہیں ہوتی جو جمہور مسلمانوں کی ہوتی ہے (کیونکہ جمہور مسلمان تو سنت سے مراد حدیث ہی لیتے ہیں) اس طرح یہ لوگ عام مسلمانوں کو ایک غلط تاثر دیتے ہیں اور اسی لیے ان کے مخالفین کو ان پر یہ پھبتی کسنے کا موقع مل جاتا ہے کہ ﴿يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ إِلاَّ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾

☆ جمہور علماء، جمہور امت اور جمہور اہل علم کے بارے میں مضمون کے آخری حصے (ص۱۳۰) میں وضاحت موجود ہے۔

## سنت کا اثبات، تواترِ عملی سے

مندرجہ بالا بحث سے قارئین اب اس بات کو سمجھ گئے ہوں گے کہ بات نظری معنوں میں سنت کی نہیں ہے کیونکہ ان معنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے حجت اور سند ہونے کے بارے میں تو کوئی مسلمان برعکس رائے رکھ ہی نہیں سکتا، اس کا انکار تو بعض منکرین سنت بھی نہیں کرتے ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب سنت کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ اصلاحی صاحب کے نزدیک اس کا جواب ہے 'تواتر عملی'...... وہ لکھتے ہیں

> ''جس طرح قرآن قولی تواتر سے ثابت ہے، اسی طرح سنت امت کے عملی تواتر سے ثابت ہے مثلاً ہم نے نماز اور حج وغیرہ کی تمام تفصیلات اس وجہ سے نہیں اختیار کیں کہ ان کو چند راویوں نے بیان کیا بلکہ یہ چیزیں نبی ﷺ نے اختیار فرمائیں ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام نے، ان سے تابعین پھر تبع تابعین نے سیکھا ۔ اس طرح بعد والے اپنے اگلوں سے سیکھتے چلے آئے۔''[۵]

مولانا کا یہ موقف انتہائی کمزور ہے اس لیے کہ

① قرآن کے الفاظ بین الدفتین متعین ہیں ، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کی ضمانت دی ہے۔ اس کا تحریری ریکارڈ پہلے دن سے لے کر آج تک محفوظ ہے ۔ زبانی یاد کرنے کی وجہ سے بھی وہ ایک نسل سے دوسری نسل کو بلا انقطاع منتقل ہو رہا ہے لیکن ان ساری چیزوں کا اطلاق سنت پر نہیں ہوسکتا ۔ اس کے الفاظ بین الدفتین متعین نہیں ، انہیں زبانی یاد کرنے کے رواج میں تسلسل موجود نہیں ۔ اور نہ پہلے دن سے ان کا مکمل تحریری ریکارڈ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ نے تیار کیا ۔ لہٰذا یہ کہنے کی کوئی ٹھوس بنیاد موجود نہیں کہ احادیث کے موجودہ ریکارڈ سے باہر سنت 'تواتر عملی' سے اُمت میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔

② امامِ دارِ ہجرت مالک بن انسؒ کی تاریخ پیدائش ۹۳ھ کی ہے یعنی صرف ایک صدی بعد انہوں نے 'تواتر عملی' کی بنا پر صرف 'عمل اہل مدینہ' کو اخبارِ آحاد پر ترجیح دینے کا موقف اپنایا لیکن جمہور اُمت نے اِسے بھی مسترد کر دیا اور اس پر تند و تیز تنقیدیں کیں ۔ چنانچہ

مالکیہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں اور اس کے بعد سے اُمت میں متداول کسی معروف فقہی اور علمی مسلک اور کسی معتدبہ بڑے عالم نے اس موقف کی حمایت نہیں کی☆۔ یہ 'سعادت' صرف مولانا اصلاحی کے حصے میں آئی کہ انہوں نے ایک صدی نہیں، سارے زمانے کے مسلمانوں اور صرف مدینہ نہیں، سارے امصار کے مسلمانوں کے عمل کو اَخبارِ آحاد پر ترجیح دینے کا 'جرأت مندانہ' موقف اپنایا اور یہی نہیں بلکہ اس طرح ثابت ہونے والی سنت کو قرآن کی طرح حجت اور قرآن کی طرح مستند و قطعی الثبوت قرار دیا اور اس کے انکار کو قرآن کا انکار قرار دیا۔

④ اب سنت چونکہ قرآن کی طرح بین الدفتین متعین الفاظ کا مجموعہ نہیں لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس 'تواترِ عملی' سے جو سنت ثابت ہوتی ہے وہ ہے کیا؟ ظاہر ہے اس کا جواب انہی کے ذمے ہے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کیونکہ خود مولانا اصلاحی تسلیم کرتے ہیں کہ

> ''سنت قرآن کی تفصیل ہے اور وہ اتنی زیادہ تفصیل ہے کہ قرآن کی طرح کوئی ایک کتاب اتنی تفصیل دینے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔''[۹]

مولانا کا جو اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اس میں مولانا نے نماز اور حج کی مثال پیش کی ہے کہ وہ تواترِ عملی سے ثابت ہوتے ہیں ۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ نماز اور حج کے بارے میں بنیادی احکام تو قرآن مجید میں بھی موجود ہیں ،ہمیں نشاندہی کی جائے کہ وہ کون سے تفصیلی (فروعی) احکام ہیں جو تواترِ عملی سے ثابت ہوتے ہیں؟ اور یہ بھی بتایا جائے کہ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں نے نماز اور حج کے بارے میں جو بدعتیں ایجاد کر لی ہیں اور جو نسل در نسل منتقل

---

☆ دراصل فقہ میں عمل اہل مدینہ کی حجیت کا اُصول بعض مالکیہ نے اپنایا جو اَب امام مالکؒ کے حوالے سے شہرت پا گیا ہے۔ حالانکہ امام مالک نے اسے مدینہ منورہ کے بعض اُن پیمانوں وغیرہ کے سلسلہ میں اہمیت دی ہے جو نبی کریم کے زمانہ سے مروّج چلے آرہے تھے جیسے کوفی صاع کے مقابلہ میں مدنی صاع (۲ سیر، ۱۰ چھٹانک، ۳ تولے، ۴ ماشہ وزن کا ایک پیمانہ)، اس طرح کی اشیا کی پہچان یقیناً رواج سے ہوسکتی ہے۔ بلکہ آج بھی بعض حضرات نے صاع کا مدنی پیمانہ بطورِ نمونہ سنبھال رکھا ہے۔ ورنہ امام مالکؒ کے بیشتر اجتہادات ایسے ہیں جو عمل اہل مدینہ کے مخالف ہیں جن کی کافی مثالیں حافظ ابن قیمؒ نے إعلام الموقعین (جلد ۲ رصفحہ ۴۱۰ تا ۴۲۲) میں جمع کردی ہیں۔ (محدث)

ہو رہی ہیں کیا وہ بھی سنتِ ثابتہ ہیں؟ (کہ آپ کی تعریف کی رو سے تو وہ سنت ثابتہ ہی ہونی چاہئیں!) اور اگر وہ سنت ثابتہ نہیں ہیں تو کیوں نہیں ہیں؟ اور اس امر کی وضاحت بھی کی جائے کہ سنت ثابتہ اور بدعت میں فرق کیسے کیا جائے گا؟۔

④ مولانا چونکہ ذہین آدمی تھے اس لیے انہوں نے خود ہی محسوس کر لیا کہ 'تواترِ عملی' کی جو تعریف انہوں نے کی ہے، اس میں وہ پھنس جائیں گے لہٰذا انہوں نے اگلے پیراگراف میں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کی اور کہا

''یہاں اس امر کو بھی ذہن نشین رکھیے کہ امت کے عملی تواتر سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفاے راشدین اور صحابہ کا عمل ہے جیسا کہ ارشاد ہے «فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين» کہ [ دین کا مرکز یہی گروہ ہے۔ اس وقت جو بھیڑ ایسے اعمال کی حامل ہے جو قرآن وسنت سے صریحاً متناقض ہیں تو یہ سب اہل بدعت ہیں۔''⑤

لیجئے پچھلے پیراگراف میں تواترِ عملی کی جو صورت انہوں نے بیان کی تھی، اس پیراگراف میں انہوں نے اس کی خود ہی تردید کر دی۔ یہ صریح تناقض ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ پچھلے پیراگراف میں انہوں نے کہا تھا کہ سنت قرآن کی طرح تواترِ عملی سے ثابت ہے جسے آپؐ سے صحابہ کرام نے ان سے تابعین پھر تبع تابعین نے اور اس طرح ہر نسل پہلی نسل سے قرآن کی طرح لیتی رہی۔ اب بعد والے پیراگراف میں انہوں نے تسلیم کر لیا کہ بعد والی نسلوں میں تو بدعات داخل ہو گئی تھیں لہٰذا سنت کا تواترِ عملی صرف 'ایک نسل' تک محدود☆ ہے یعنی حضور ﷺ سے صحابہ تک اور سارے صحابہ تک بھی نہیں صرف خلفاءِ راشدین تک اور اس

---

☆ اصلاحی صاحب نے اُمت سے اختلاف ہی سنتِ نبوی کے ثبوت کے بہانہ سے کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ امت سنتِ نبوی یعنی احادیث کی روایت کے پرکھنے کے محدثانہ ذرائع کو اسی طرح قابل اعتماد سمجھتی ہے جس طرح کوئی جج اپنے عمر بھر کے تجربے کے باوجود اپنے فیصلے کا مدار گواہان پر رکھتا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے 'رسالہ' میں رواۃ حدیث کو گواہانِ سنت سے تعبیر کیا ہے جبکہ اصلاحی صاحب اس ثبوت کے لئے تعامل اُمت کو بنیاد بناتے ہیں۔ ان کی عبارت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احادیث کے بارے میں منکرین حدیث کے شبہات سے اس قدر متاثر ہیں کہ 'روایت' کے نام سے ہی الرجک ہیں، جس کام میں روایت آ جائے وہ اس کو اہمیت دینے سے گھبراتے ہیں، اس میں غلطی کا امکان ان کے ذہن میں ایسا سمایا ہے کہ وہ اس سے باہر نہیں نکل پا رہے۔

کی دلیل بھی کیا دی ؟ فعلیکم بسنتی ...... الحدیث یعنی ایک خبر واحد جو ظنی الثبوت اور ان کے نزدیک نا قابل اعتماد ہے۔ **فاعتبروا یا أولی الأبصار!**

یعنی تاثر آپ نے یوں دیا کہ 'تواترِ عملی' گویا ایک سمندر ہے پھر جب بات کا پیچھا کیا تو بات دریاؤں، نہروں، ندی نالوں سے ہوتی ہوئی اس منبع تک پہنچ گئی جہاں سوئی کی طرح ایک دہانے سے پتلی سی دھار نکل رہی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اگر 'تواتر عملی' محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ بلکہ صرف خلفاء راشدین تک محدود ہے تو اسے قرآن کے تواتر عملی کی طرح حجت کیسے کہا جا سکتا ہے؟ کہ قرآن کا تواتر تو آج بھی جاری ہے۔ پھر اس ایک نسل یا چند افراد کے تواتر پر وہ نتائج کیسے مرتب ہو سکتے ہیں جو قرآن کے نسل در نسل تواتر پر مرتب ہوتے ہیں؟

اہم ترین سوال یہ ہے کہ اگر یہ تواتر صرف عہدِ صحابہ تک محدود تھا تو پھر آج یہ تواتر ہمیں کیسے معلوم ہو گا یعنی اس تواتر کی ہم تک منتقلی کا ذریعہ کیا ہے؟ اور بفرضِ محال اگر یہ ہمیں معلوم ہو جائے تو 'تواتر عملی' کی عدم موجودگی میں اس کی حیثیت کیا ہوگی؟ غرض مولانا کے اس متضاد موقف سے اتنے لاینحل سوالات اٹھتے ہیں کہ الامان!

⑤ اس دلدل میں مولانا عبد الغفار حسن بھی پھنسے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری تک کا تعامل امت تو حجت ہے، اس کے بعد کا نہیں۔ (دیکھئے کتاب کا صفحہ نمبر ٦٦)

گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلی چھ صدیوں میں جو بدعات مروّج ہوئیں وہ تو حق ہیں اور جو بعد میں ہوئیں وہ قابل قبول نہیں۔ اصلاحی صاحب کو تواتر عملی کے لیے دلیل لانا پڑی تو وہ عہد صحابہ تک رک گئے۔ محدثین نے قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم «خیرکم قرنی ثم الذین

---

➡ اب تعامل امت کی تان ٹوٹتی ہے تو صرف ایک نسل اور اس کے بھی چند افراد پر، یہاں پھر وہی سوال باقی ہے کہ یہ تعامل آج اُمت تک معتمد ذریعہ سے نسلاً بعد نسل کیسے پہنچے؟ اس کا جواب انہی کے ذمہ ہے، یہ متبادل ذریعہ بشرطیکہ انہیں کوئی سوجھ جائے، تو اس کی استنادی حیثیت کیا ہوگی؟ وہ اور ان کے رفقا اسے کیا مقام دیں گے؟

ہماری رائے میں یہ صرف شریعت میں اپنی من مانی کرنے کے لئے اَلفاظ کا جال ہے جس میں مسلمان اُلجھ کر رہ جائے۔ تعامل امت کے بہانے سے عوام مسلمان انہیں امت کے مجموعی دھارے سے بھی الگ تصور نہ کریں اور وہ علمی موشگافیوں کے ذریعے اپنی مرضی کا اسلام بھی جاری کر لیں اور اس طرح حدیثِ نبوی کی پابندی کرنے سے بچ نکلیں۔

یلونھم ثم الذین یلونھم[8] کو سامنے رکھ کر معاملہ تابعین تک پہنچا دیا۔ دیکھئے مولانا عبد الغفار حسن کس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے تعامل اُمت کے معاملے کو ساتویں صدی تک کھینچ کر لاتے ہیں؟ حالانکہ بگاڑ کی سرعت کا یہ عالم تھا کہ رافضیت ، خارجیت اور قدریت کے تینوں فرقے پہلی صدی میں نہیں ،عہد صحابہ میں نہیں بلکہ عین دورانِ خلافتِ راشدہ پیدا ہو چکے تھے ،اور دوسری صدی میں تو وہ 'فتنۂ عظیم' تصوف بھی پیدا ہو چکا تھا جسے تلامذۂ امین احسن اصلاحی اسلام کے متوازی ایک دوسرا دین سمجھتے ہیں ۔اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ہمارے یہ مہربان سنت کو 'تواترِ عملی' بلکہ بالفاظِ صحیح تعامل اُمت سے ثابت کرنے کے مسئلے پر ایک دفعہ پھر غور کرلیں تو بیچاری اُمت پر احسانِ عظیم ہوگا۔

⑥ پھر مولانا اصلاحی اس سنت کو جو ان کی مزعومہ 'تواترِ عملی' سے ثابت ہو، احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مھیمن (نگران) قرار دیتے ہیں۔ان کے الفاظ میں

''اگر روایات کے ریکارڈ میں ان [سنن ثابتہ] کی تائید موجود ہے تو یہ اس کی مزید شہادت ہے ۔اگر وہ عملی تواتر کے مطابق ہے تو فبہا اور اگر دونوں میں فرق ہے تو ترجیح بہر حال اُمت کے عملی تواتر کو حاصل ہوگی۔''

اور بات صرف ترجیح کی نہیں ، بلکہ اگر کسی حدیث کا مضمون ان کی رائے میں اس 'سنتِ ثابتہ' کے خلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں

''اگر کسی معاملے میں اخبارِ احاد ایسی ہیں کہ عملی تواتر کے ساتھ ان کی مطابقت نہیں ہو رہی ہے تو ان کی توجیہ تلاش کی جائے گی ۔اگر توجیہ نہیں ہو سکے گی تو بہر حال انہیں مجبوراً چھوڑا جائے گا اس لیے کہ وہ ظنی ہیں اور سنت ان کے بالمقابل قطعی ہے[9]۔''

مولانا اصلاحی کا یہ موقف جمہور اُمت کی رائے کے بالکل برعکس ہے۔ جمہور اُمت کا موقف یہ ہے کہ وہ حدیث وسنن کے صحیح اور ثقہ راویوں سے مروی ریکارڈ کو سنت کا مظہر سمجھ کر متبرک اور مقدس گردانتے ہیں۔ وہ اسلاف کی ان محنتوں کی قدر کرتے ہیں جو انہوں نے اسماء الرجال، جرح وتعدیل، تدوین حدیث اور روایت ودرایت کے اُصولوں کو مرتب کرکے کی ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سارے قیمتی ذخیرۂ علم کی بنا پر قابل اعتماد راویوں سے روایت کردہ صحیح احادیث

سے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہو جاتی ہے لہٰذا ان احادیث پر عمل ضروری ہے۔ یہ رویہ بلاشبہ امت کے سارے فقہی وکلامی مسالک کا ہے۔ اگرچہ مالکیوں اور احناف میں سے بعض ☆ ایک آدھ استثنائی صورت میں خبر واحد پر بعض دوسری فقہی دلیلوں کو ترجیح دیتے ہیں لیکن جمہور حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ، ظاہریہ، اہل تشیع وغیرہ نے ان کے اس موقف کو ردّ کر دیا ہے اور اس پر تند و تیز تنقیدیں کی ہیں اور اس تنقید کے مثبت اثرات متاخرین اَحناف و مالکیہ پر نمایاں نظر بھی آتے ہیں لہٰذا مولانا اصلاحی کا تواترِ عملی کے نہایت مبہم اور تصوراتی نظریئے کی بنا پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ردّ کرنے کا فیصلہ بالکل غلط ہے۔

⑦ اگر اصلاحی صاحب خلوصِ نیت سے تواترِ عملی اور تعامل اُمت کو حجت مانتے ہیں تو اصلاحی صاحب کو احادیث کی حجیت کو مان لینا چاہیے کیونکہ جمہور اُمت کا تعامل چودہ صدیوں سے یہی ہے کہ وہ احادیثِ رسول کی حجیت کو تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح اصلاحی صاحب کو رجم (اور احادیثِ رجم کو) بھی مان لینا چاہیے کیونکہ رجم پر امت کا مسلسل چودہ سو سال سے تعامل موجود ہے اور ان طویل صدیوں میں کسی ایک شخص نے بھی اس موقف کو اپنایا ہے، نہ اس پر عمل کیا ہے جو رجم کے حوالے سے مولانا اصلاحی کا ہے۔ لہٰذا رجم کے بارے میں مولانا کا موقف خود ان کے اپنے وضع کردہ 'تواترِ عملی' اور 'سنت ثابتہ' کے اصول کی رو سے قابل ردّ ہے۔

⑧ احادیث کے بارے میں مولانا اصلاحی کا رویہ کتنا ناانصافی پر مبنی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل معاملے پر غور کیجئے:

☜ جمہور علما کا موقف یہ ہے کہ احادیث رسول ﷺ حجت ہیں (یعنی وہ احادیث جو

---

☆ جیسے عیسیٰ بن ابان غیر فقیہ صحابہ کی حدیث پر قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے اسے 'قیاس' کے بجائے 'درایت' کا نام دیا ہے، گویا اس طرح حدیث پر فقہ کو بالادستی دینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فن حدیث اور فقہ کے مقاصد ہی مختلف ہیں۔ فن حدیث میں 'درایت' کا تعلق خبر واقع کی تحقیق سے ہے جبکہ فقہ 'خبر' کے بجائے مجتہد کی استنباطی شے ہوتی ہے۔ استنباط واجتہاد میں درایت کے اُصول استحسان، استصلاح وغیرہ کہلاتے ہیں۔ جبکہ اصولِ حدیث میں 'درایت' محدثین کے طریقہ پر خبر کی واقعاتی تحقیق کہلاتی ہے جو کہ محدثانہ طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اگر ایک فن کی اصطلاح دوسرے فن میں خلط ملط کر دی جائے تو کئی مغالطے پیدا ہوسکتے ہیں۔ (محدث)

'صحیح' ہوں اور ان کے راوی ثقہ ہوں) ان میں آپؐ کے اَقوال بھی محفوظ ہیں اور آپؐ کے اَفعال بھی۔ بہت سے امور میں تعامل اُمت ان احادیث کے مطابق ہے لہٰذا اس سے احادیث کے قابل اعتماد اور صحیح ہونے کی تائیدِ مزید ہو جاتی ہے۔

☜ مولانا اصلاحی کا موقف یہ ہے کہ حدیثیں ظنی الثبوت اور مجموعہ رطب ویابس ہیں۔ اگر کوئی حدیث سنتِ متواترہ کے مطابق ہے تو یہ اس سنتِ متواترہ کی تائید مزید ہے اور اگر اس کے خلاف ہے تو قابل ردّ ہے[۱۰]۔

ان دونوں عبارتوں کو ذرا توجہ سے دوبارہ پڑھیے تو آپ محسوس کرلیں گے کہ ایک ایسی بات جس سے احادیث کی تائید ہوتی اور ان کی ثقاہت پر اعتماد بڑھتا ہے، مولانا نے اسے اس طرح الٹا گھما دیا ہے کہ احادیث کی وہ خوبی نہ صرف نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے بلکہ ان کی کمزوری بن جاتی ہے۔ یہ ہے منفی ذہانت!!

⑨ 'سنتِ ثابتہ' اور 'تعامل اُمت' کو احادیث پر مُھیمن بنانے کی زَد بالآخر کہاں پڑتی ہے اس پر بھی ذرا غور فرمالیجئے! کسی ایک بدعت مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت کو بطورِ تقریب منانے کی مثال لے لیجئے۔ تقریباً تیسری صدی ہجری سے آج تک متواتر یہ عید میلاد کسی نہ کسی صورت میں منائی جاتی ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت بھی یہ عید مناتی ہے (یہ ایک حقیقت ہے [گو تلخ سہی] کہ مملکت پاکستان میں آج بھی اکثریت ان لوگوں کی ہے جو یہ عید مناتے ہیں اور مولانا اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن اور ہماری طرح کے جو لوگ اسے بدعت سمجھتے ہیں، وہ ان کے مقابلے میں اقلیت میں ہیں)۔ اب حدیث کو حجتِ شرعی سمجھنے والوں کے پاس تو عید میلاد کی اس بدعت کو ردّ کرنے کے لیے ثقہ راویوں کی روایت کردہ صحیح احادیث موجود ہیں لیکن مولانا اصلاحی کے تواتر عملی اور تعامل امت کے فلسفے کی بنا پر تو عیدِ میلاد کا منانا حجتِ شرعی ہونا چاہیے؟ اگر آپ کے نزدیک یہ حجت نہیں ہے تو فرمائیے کہ کیوں نہیں ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو حدیث سے باہر آپ کے پاس اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟

# قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا کردار

سنت اور حدیث میں فرق کرنے اور حدیث کو ظنی الثبوت ، مجموعہ رطب و یابس اور صحت کے لحاظ سے ناقابل اعتماد قرار دینے کے بعد جب مولانا اصلاحی فہم قرآن میں حدیث کے کردار کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ قرآن فہمی کا اصل انحصار اس کے داخلی وسائل پر ہے جس میں وہ قرآن کی زبان، اس کے نظم اور تفسیر القرآن بالقرآن کو شامل کرتے ہیں۔ اس کے خارجی وسائل میں وہ 'سنتِ متواترہ' کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد کہیں پانچویں نمبر پر وہ 'احادیث و آثار صحابہؓ' کو لاتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ اپنے طے کردہ 'داخلی وسائل' کو حدیث پر مُہیمن بناتے اور ان سے اختلاف کی صورت میں حدیث کو رد کرتے ہوئے (جیسا کہ انہوں نے رجم کے معاملے میں کیا ہے)۔ اسی طرح وہ حدیث سے قرآن کے نسخ و تخصیص☆ کا بھی انکار کرتے ہیں۔ (۱۱)

قرآن فہمی یا تفسیر قرآن میں حدیث وسنت کے کردار کے حوالے سے مولانا اصلاحی کا یہ موقف نہ صرف غلط ہے بلکہ جمہور اہل علم کے موقف کے برعکس بھی ہے لیکن اپنی خدا داد ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے ان کا طریق واردات یہاں بھی وہی ہے جو پچھلے مبحث میں تھا کہ ؎ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ وہاں انہوں نے حدیث وسنت میں فرق اور تواترِ عملی کے اثبات میں جو موقف اختیار کیا وہ مغالطوں اور تضادات سے پُر تھا اور انہوں

---

☆ حدیث سے قرآن کی تخصیص کے تو جمہور فقہا قائل ہیں البتہ نسخ کے بارے میں امام شافعیؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حدیث سے مطلقاً قرآن کے نسخ کے قائل نہیں اور وجہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ حدیث کا درجہ قرآن سے کم تر ہے لیکن امام شوکانیؒ نے اصولِ فقہ پر اپنی مشہور تالیف 'ارشاد الفحول' (ص ۱۶۸) میں امام شافعی کے قول کی امام زرکشی کی طرف سے توجیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام شافعی کا مقصود یہ ہے کہ قرآن سنت کو منسوخ نہیں کرسکتا اور نہ سنت قرآن کو (ملخصاً)۔ گویا امام شافعیؒ نسخ کی یہ بات دونوں کے مرتبہ کے فرق کی بنا پر نہیں کہتے۔ الفاظِ قرآن کا مرتبہ بلاشبہ مفہومِ حدیث پر بالا ہی ہے لیکن امام شافعیؒ کا مقصد یہ ہے کہ دونوں کا باہمی تعلق ناسخ ومنسوخ کا نہیں، بلکہ اِجمال وبیان کا ہے لہٰذا ان میں ٹکراؤ پیدا کرنے کے بجائے ان کو باہم ملا کر مفہومِ شریعت متعین کرنا چاہیے جیسے ایک دوسری جگہ ان کے الفاظ یوں ہیں: نزل القرآن جملة حتی بيّنه الرسول قرآن اجمالی حیثیت سے اُترا جبکہ سنت اس کی تبیین و وضاحت کرتی ہے۔ (محدث)

نے اس موقف کی تاویل در تاویل اس طرح تفصیل کی کہ ان کا موقف منکرین سنت کے قریب جا پہنچا۔ یہاں قرآن فہمی میں حدیث و سنت کے کردار کے حوالے سے بھی ان کا موقف تضادات سے مملو اور انکارِ سنت کے قریب جا پہنچتا ہے چنانچہ پچھلے پیراگراف میں آپ نے ان کا یہ موقف پڑھا کہ وہ حدیث کو ناقابل اعتماد سمجھتے ہوئے پانچویں نمبر پر لاتے ہیں، اب ان کا ایک اور موقف پڑھیے۔ 'سلف کا طریقۂ تفسیر' کے عنوان سے مبادیٔ تدبرِ قرآن میں وہ کہتے ہیں:

''انہی وجوہ سے سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ پہلے وہ قرآن کو خود قرآن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے، اس کے بعد اگر کوئی مشکل باقی رہ جاتی تو اس کا حل رسول اللہ ﷺ کے اَقوال و اَفعال میں تلاش کرتے۔ اس کے بعد بھی اگر معاملہ کا کوئی گوشہ محتاجِ توضیح رہ جاتا تو اس کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار و اقوال سے مدد لیتے۔''

پھر فرماتے ہیں کہ

''تفسیر کا یہ طریقہ بالکل فطری ہے، اصلی چیز خود قرآن کے الفاظ اور اس کی اپنی توضیحات ہیں۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور تیسرا درجہ اقوالِ صحابہ کا ہے۔''[۱۲]

اور نہ صرف یہ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اہل علم کا یہ موقف نقل کرتے ہیں اور اس کا معارضہ بھی نہیں کرتے کہ احادیث اگر صحیح اور ثابت شدہ ہوں تو وہ قرآن فہمی کا ماخذ اوّل ہیں۔[۱۳] چنانچہ وہ صاحبِ 'الاتقان' کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

''تفسیر کے بہت سے ماخذ ہیں جن میں سے چار اُصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اول وہ نقل ہے جو آنحضرت ﷺ سے مروی ہے اور یہی مقدم ترین ہے لیکن اس باب میں ضعیف وموضوع سے احتراز واجب ہے کیونکہ اس قسم کی روایات بہت ہیں[۱۴]۔''

اب ان دونوں مواقف میں اتنا صریح تضاد ہے کہ آدمی پریشان ہو جاتا ہے کہ اصلاحی صاحب ان دونوں باتوں کو بیک وقت کیسے مان سکتے ہیں؟

① ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ سلف صالح نے اختیار کیا اور جو تفسیر کا فطری طریقہ ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن کے بعد قرآن کی تفسیر حدیث سے کی جائے بلکہ اہل علم کا یہ موقف بیان بھی کرتے ہیں اور اس کی مخالفت بھی نہیں کرتے کہ صحیح اور ثابت شدہ احادیث تفسیر کا اوّلین ماخذ ہیں جب کہ دوسری جگہ وہ احادیث کو آثارِ صحابہ کے ساتھ

کر کے تفسیر کے اُصولوں میں قرآن کی زبان، نظم قرآن، تفسیر القرآن بالقرآن اور سنت ِ ثابتہ کے بعد پانچویں نمبر پر لاتے ہیں۔ ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہئے؟

② ہمارا خیال تھا کہ ہم امت کے سارے اہم اور معتد بہ مفسرین اور علماء کے تفصیلی حوالے دیتے جنھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ حدیث وسنت قرآن کی تفسیر کا دوسرا بڑا ماخذ ہیں (بلکہ ہم نے ابتدائی کوشش میں امام شافعی[15]، طبری[16]، قرطبی[17]، ابن کثیر[18]، آلوسی[19]، ابن تیمیہ[20]، شاطبی[21] اور راغب اصفہانی[22] کے حوالے اکٹھے بھی کر لیے تھے) اور ان علماء و محدثین کے حوالے بھی دیتے جنھوں نے کہا ہے کہ حدیث وسنت تفسیر قرآن کا اوّلیں ماخذ ہیں (مثلاً یحییٰ بن ابی کثیر[23] اور مکحول[24] وغیرہ) لیکن جب اصلاحی صاحب خود اس موقف کو جانتے اور مانتے ہیں تو ان حوالوں کا ذکر محض تطویل ہوگا۔

③ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اِصلاحی نے اپنی منفی ذہانت سے اسلاف کے اس موقف کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے کہ 'تفسیر القرآن بالقرآن' کا اصول، تفسیر کا پہلا ماخذ ہے۔ اسلاف کا مقصد اس سے یہ تھا کہ قرآن کے ایک مقام کی تفسیر اگر قرآن میں کسی دوسرے مقام سے ہو جائے تو یہ امر کافی ہے۔ ان کا مقصود اس سے 'اپنے فہم قرآن' کو حدیث پر مُہیمن☆ بنانا

---

☆ قرآن وسنت کی ایک دوسرے پر چوکیداری کی یہ ساری بحثیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ان کو ایک دوسرے کا معاون وموضح سمجھنے کے بجائے، ایک دوسرے کا مخالف سمجھ لیا جائے۔ اللہ کا نبی ہی قرآن لے کر آیا، اس کے بتلائے ہوئے الہامی الفاظ قرآن قرار دیے گئے اور شریعت کا عملی نقشہ حدیث وسنت کی صورت میں محفوظ ہوا۔ قرآن اور سنت دونوں مل کر شریعت ہیں اور دونوں ہی وحی الٰہی ہیں۔ اللہ کے رسول نعوذ باللہ اللہ کی مخالفت کرنے نہیں آئے تھے جس کی کلام وہ قرآن بتا رہے ہیں، بلکہ قرآن کے مطابق اسی کی تائید وتشریح کے لئے آئے تھے، لہٰذا دونوں کی باہمی وضاحتوں کو ایک دوسرے پر اعتداء کیوں سمجھا جائے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایک حدیث صحیح ثابت ہو جائے، دوسرے لفظوں میں اس کا ارشادِ نبیؐ ہونا مستند ہو جائے تو اس ارشادِ نبوی کو وہی حیثیت دی جائے جو خود نبی کریم ﷺ کی الفاظِ قرآن کے بارے میں تھی۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق کے ایسے رویے پر سخت تنبیہ فرمائی ہے سورۃ النساء ۱۵۰/ میں ارشاد ربانی کا ترجمہ یوں ہے ''وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہوئے ان کے مابین فرق کرنا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے کفر کرتے ہیں، اس طرح وہ ایک درمیانی راستہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی لوگ پکے کافر ہیں''۔ (محدث)

نہیں تھا لیکن مولانا اصلاحی نے یہ کیا کہ تفسیر القرآن بالقرآن کے لیے جو اصول انہوں نے از خود وضع کیے، ان کی بنیاد پر انہوں نے صحیح، ثابت شدہ اور اُمت کے نزدیک چودہ سو سال سے مقبول و معمول بہ احادیث کو ردّ کر دیا (رجم کا معاملہ اس کی ایک مثال ہے)۔

ممکن ہے اصلاحی صاحب کے تلامذہ کہیں کہ 'استاد امام' کے اصولِ تفسیر میں کون سی بات نئی ہے جسے بدعت کہا جا سکے؟ ہمیں اس پر یاد آ رہا ہے کہ یہ تماشا چند سال پہلے مصر میں ہوا تھا کہ حکومت نے چند تنخواہ دار حکومتی علما کو ذمہ داری سونپی اور انہوں نے متقدمین علما کے بعض شاذ اَقوال ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کر دیئے جن کی مدد سے مصری حکومت نے ایک ایسا عائلی قانون بنا دیا جو 'روشن خیال اور ترقی یافتہ' مغربی تہذیب کے اصولوں کے مطابق تھا مثلاً اس میں طلاق کا حق مرد کی بجائے عورت کے ہاتھ میں تھا، طلاق کے بعد بھی عورت کا نفقہ مرد کے ذمے تھا، وغیرہ وغیرہ۔ جب علماء اور عوام نے اس قانون کی مخالفت کی تو سرکاری علماء نے کہا کہ یہ قانون تو سارے کا سارا متقدمین فقہا کی آرا پر مشتمل ہے اور حوالے پیش کیے لیکن یہ چالبازی نہ جمہور علما کو مطمئن کر سکی نہ مسلمان عوام کو، چنانچہ اس قانون کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور بالآخر حکومت کو یہ قانون واپس لینا پڑا۔ اسی طرح مولانا اصلاحی سنتِ ثابتہ اور تفسیر القرآن بالقرآن جیسی مانوس اصطلاحات استعمال کر کے ان کے ذریعے جو نامانوس اور غلط فکر پیش کر رہے ہیں، اسے نہ جمہور علما مانیں گے نہ جمہور اُمت۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ اصول علماءِ امت کے ہیں تو انہوں نے اس طرح انہیں استعمال کیوں نہیں کیا اور امت میں یہ مجموعی طرزِ عمل رواج کیوں نہیں پایا۔ لازمی سی بات ہے کہ ان کے چند اقوال سیاق وسباق سے ہٹا کر، یا چند شاذ اقوال جمع کر کے ان کی بنیاد پر عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے گویا اپنی بات زبردستی ان علماء کے منہ میں ٹھونسی جا رہی ہے۔

④ فہم قرآن اور تفسیر قرآن کے حوالے سے صحیح موقف یہ ہے اور اس پر سارے مفسرین اور اہل علم متفق ہیں کہ کسی قرآنی آیت کی کوئی تفسیر اگر رسول اللہ ﷺ سے (صحیح متن کے ساتھ اور ثقہ راویوں کے ذریعے [مقبول حدیث کی شرائط کے مطابق]) منقول ہو تو وہ حجت اور سند ہے۔ اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کے کسی پہلو کی جو تفسیر نبی

ﷺ کر دیں تو کوئی مسلمان مفسر اس تفسیر کو یہ کہہ کر ردّ نہیں کر سکتا کہ اس کی رائے میں یہ تفسیر غلط ہے۔ اصلاحی صاحب نے یہی تو کیا ہے کہ رجم کے معاملے میں اپنی تفسیر قرآن کو نبی کریم ﷺ کی تفسیر قرآن پر مُہیمن ٹھہرا دیا ہے۔

اَسلاف میں سے جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ السنة قاضية على الكتاب[25] یا القرآن أحوج إلى السنة من السنة إلى القرآن[26] (اور یہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے پہلا قول یحییٰ بن ابی کثیر (م ۱۲۹ھ) کا ہے جن کے بارے میں ذہبی[27] اور ابن حجر[28] کا یہ کہنا ہے کہ کان من ثقات أهل الحديث ورجحه بعضهم على الزهري دوسرا قول مکحول بن ابی مسلم (م ۱۱۲ھ) کا ہے جن کے بارے میں امام زہری کا قول ہے: "لم يكن في زمنه أبصر منه بالفتيا"۔ ذہبی[29]، ابن حجر[30] اور اسماء الرجال پر دوسرے لکھنے والے انہیں من حفاظ الحدیث اور فقیہ شام کے لقب سے پکارتے ہیں) اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کی جو تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی ہے وہ حجت اور حرفِ آخر ہے۔ اب قرآن کے اس کے علاوہ کوئی دوسرے معنی نہیں لیے جا سکتے اور یہ موقف بالکل صحیح ہے۔ اس کا مطلب خدانخواستہ سنت کو قرآن پر مُہیمن بنانا نہیں بلکہ تفسیر قرآن میں نبی کریم ﷺ کے فہم قرآن کو ماسوا پیغمبر کے باقی سب پر مُہیمن بنانا ہے۔ ورنہ کون صحیح الدماغ مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ سنت قرآن پر مُہیمن ہے یا سنت قرآن پر مقدم ہے؟

⑤ ہم اصلاحی صاحب کے اس موقف کو بھی صحیح نہیں سمجھتے جس میں انہوں نے (صحیح و ثابت شدہ) احادیث کو تفسیر قرآن میں پانچویں نمبر پر رکھتے ہوئے اس میں آثارِ صحابہ کو بھی ساتھ شامل کر دیا ہے۔ ہم صحابہ کرام کی عظمت کے بڑے قائل اور ان کے بڑے مداح ہیں۔ وہ اُمت کے لیے منارۂ نور ہیں، وہ انبیاء کے بعد ساری دنیا سے افضل ہیں، خدا نے انہیں صحبتِ رسول اللہ ﷺ اور غلبہ اسلام کے لیے چن لیا تھا...... غرض ان کے اِکرام میں جتنا بھی مبالغہ کیا جائے کم ہے لیکن قانونی بات یہی ہے کہ وحی صرف محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی تھی اور دین کا ماخذ قرآن کے بعد صرف سنت رسول ﷺ ہے۔ سنت کی حجیت میں صحابہ کرامؓ کو شامل کرنا، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اکرام نہیں مقام

رسالت کا استخفاف ہے۔ صحابہ کرامؓ کے اقوال و افعال سر آنکھوں پر لیکن کسی صحابی کے قول و فعل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے برابر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ پھر کتبِ احادیث میں روایاتِ صحابہ کیوں شامل ہیں؟ وہاں صحابہ کرام جو بات حضور ﷺ کے حوالے سے کہیں وہ تو ظاہر ہے کہ سنت کا بیان ہے۔ ہماری غرض یہ ہے کہ جہاں تک صحابہ کرامؓ کے اپنے اَقوال و اجتہادات کا تعلق ہے تو انہیں کوئی بھی صاحبِ علم سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم قرار نہیں دیتا۔

خلاصہ یہ کہ جمہور اُمت کا موقف یہ ہے کہ

① احادیث وسنن (جو ثقہ راویوں سے مروی اور صحیح المتن ہوں [آسان الفاظ میں صحیح کی شرائط پر پوری اتریں، محدث]) وہ سنتِ رسول ﷺ ہیں اور ان پر عمل ضروری ہے۔

② محض تواتر عملی یا تعامل امت سے کوئی سنت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ تواتر عملی سے سنت کا اثبات محض ایک یوٹوپیا (تخیل) ہے اور اُمت میں کبھی کسی نے یہ موقف نہیں اپنایا۔

③ قرآن فہمی میں حدیث وسنت کا کردار بنیادی اور اُصولی ہے اور حضور ﷺ اگر کسی آیت کی تفسیر فرما دیں تو وہ حتمی ہے گویا حدیث وسنت تفسیر قرآن کا اوّلیں اور معتبر ترین ماخذ ہے (یا باسلوبِ بعض قرآن کے بعد☆ اوّلین ماخذ ہے)

منکرین سنت کا موقف ہے کہ احادیث وسنن کی مرویات ناقابل اعتماد ہیں لہٰذا قرآن فہمی میں ان کا کوئی کردار نہیں۔ مولانا اصلاحی کا موقف یہ ہے کہ

① سنت سے مراد سنتِ ثابتہ ہے جو تواتر عملی سے ثابت ہوتی ہے (ہم نے سطورِ بالا میں تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ تواترِ عملی حقیقت نہیں، محض ایک یوٹوپیا ہے)۔

② احادیث ظنی الثبوت اور مجموعہ رطب و یابس ہیں اور بحیثیتِ مجموعی ان کی صحت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا لہٰذا فہم قرآن میں ان کا کوئی بنیادی کردار نہیں۔

---

☆ محدثِ جلیل علامہ البانی کے بقول شریعت کی تعبیر میں حدیث وسنت دوسرے درجے کا ماخذ نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت وحی اور شریعت ہونے کی بنا پر یکساں حجت ہیں دونوں کو ملا کر شریعت حاصل ہوتی ہے اگرچہ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے ایک کو 'قرآن' کہا جاتا ہے تو مراد الٰہی ہونے کے اعتبار سے دوسرے کو حدیث وسنت۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: کتاب کا صفحہ نمبر ۱۰۱،۱۰۲)

④ اگر کوئی حدیث فہم قرآن کے لیے ان کے وضع کردہ تفسیر القرآن بالقرآن کے اُصولوں کے خلاف ہو تو وہ قابل ردّ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی بنا پر رجم کی صحیح اور ثقہ راویوں سے مروی ان بیسیوں احادیث کو ردّ کر دیا جن کو اُمت چودہ سو سال سے قبول کرتی چلی آ رہی ہے اور ان پر عامل ہے۔

اس طرح بحیثیتِ مجموعی اور آخری نتیجے کے اعتبار سے مولانا اصلاحی کا موقف منکرین سنت کے موقف سے بہت قریب ہو جاتا ہے جس کا غلط ہونا بآسانی واضح ہے۔

ہم اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے قارئین کی توجہ چند اہم امور کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں جن کا اس موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم نے اپنے مضمون میں جو بار بار 'جمہور علماء' اور 'جمہور اُمت' کے الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس سے مقصود اصلاحی مکتبِ فکر کو یہ احساس دلانا ہے کہ حدیث وسنت کے بارے میں ان کا موقف شذوذ میں سے ہے اور امت کی معروف، عمومی اور اجتماعی سوچ کے خلاف ہے۔ کسی امام یا فقیہ کی رائے سے دلیل کے ساتھ اختلاف کیا جاسکتا ہے اور یہ کوئی گناہ یا عیب کی بات نہیں۔ لیکن ایسا موقف اپنانا جو امت میں کبھی کسی نے نہ اپنایا ہو یا کسی ایسے موقف کی تردید وتغلیط کرنا جو ہمیشہ سے اُمت اور اس کی اکثریت کا موقف رہا ہو، اپنے اندر اس امر کا غالب امکان رکھتا ہے کہ وہ 'غیر سبیل المومنین' ہونے کے ناطے غلط ہو۔ یہ محض عقلی یا منطقی بات نہیں بلکہ اس موقف کی شرعی اساس بھی موجود ہے اور مسلمانوں میں 'اجماع' کا ادارہ اسی کا مظہر ہے، مسلمانوں کی اجتماعیت یوں ہی قائم رہ سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ علمی نکتہ آفرینی اپنی جگہ لیکن اگر کوئی مکتب فکر اس امر کا مدعی ہو کہ حق اس کی تعبیر دین اور تفسیر دین میں ہی منحصر ہے تو اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہم مولانا اصلاحی یا کسی بھی دوسرے عالم کا یہ حق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ نئے علمی نکات سامنے لائے (کہ قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے اور جو بھی اس کے بحر علوم میں غواصی کرے وہ کسی گوہر کو پا سکتا ہے) یا عام مفسرین کی ہوبہو پیروی کرنے کی بجائے اپنا رستہ الگ نکالے مثلاً ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اگر مولانا اصلاحی نظم قرآن پر زور دیں یا

نزولِ قرآن کے زمانے کی نظم و نثر کو خصوصی اہمیت دیں یا اس بات کو اپنی ترجیح بنائیں کہ ہر آیت سے ایک ہی واضح حکم کا اثبات ہو لیکن اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ صرف ان کے وضع کردہ تفسیری اُصول ہی صحیح ہیں اور صرف وہی قرآن کو صحیح سمجھے ہیں یا یہ کہ ان کے وضع کردہ تفسیری اصولوں کے بغیر قرآن کے صحیح فہم کو پایا نہیں جا سکتا مثلاً مولانا اصلاحی اگر یہ کہیں کہ نظم کے بغیر قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا اور نظم کو ہم نے کھولا ہے پہلے تو کسی کو یہ توفیق نہیں مل سکی (جیسا کہ وہ کہتے ہیں)[31] تو ان کا یہ دعویٰ ردّ کر دیا جائے گا کیونکہ اس بات کو ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ امت آج تک تاریکی میں تھی اور قرآن کو سمجھ نہ سکی اور مولانا اصلاحی پہلے فرد ہیں جو قرآن کو صحیح طور پر سمجھے ہیں گویا کہ امت کے علما، فقہا، مفسرین اور محدثین پچھلے چودہ سو سال میں محض بھاڑ جھونکتے اور گھاس کھودتے رہے ہیں۔ اُمت کی کردار کشی اور سلف کی مذمت کا یہ رویہ نہ صرف یہ کہ عُجب اور مریضانہ خود پسندی کا مظہر ہے بلکہ ساری فکری گمراہیوں کی جڑ ہے۔ صحیح فرمایا تھا امام ابن تیمیہ نے کہ جو شخص سلف کے طریقے سے ہٹ کر تفسیر کرتا ہے وہ گویا بدعات کا دروازہ کھولتا ہے[32] ہم کہتے ہیں کہ ساری امت کو گمراہ اور سارے اسلاف کو غلط قرار دینے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ صرف اصلاحی صاحب کی فکر کو غلط قرار دے دیا جائے۔

پھر آپ کی حریتِ فکری، انفرادیت پسندی، آپ کی ذہانت اور رسوخِ علم سب قبول۔ آپ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی طرح مجتہد مطلق بن کر استنباط کے نئے اصول وضع کریں تو بھی قابل برداشت۔ طبری، زمخشری اور رازی کے بالمقابل نئے اُصول تفسیر لائیں تو بھی گوارا لیکن اگر آپ اپنے تفسیری اصولوں کی بنا پر اپنے فہم قرآن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم قرآن پر مقدم گردانیں گے تو ہم ہرگز نہ مانیں گے۔ حدیث و سنت کا معاملہ کوئی فرعی اور ضمنی معاملہ نہیں ہے، یہ اصول کا معاملہ ہے۔ امت چودہ سو سال سے حدیث و سنت کو قرآن کے ساتھ دین کا دوسرا ماخذ مانتی چلی آ رہی ہے، آج بھی مانتی ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک مانتی رہے گی۔

آپ اپنے شوقِ اختلاف کو اگر امتیوں تک محدود رکھتے تو قابل برداشت تھا لیکن آپ کا رویہ یہ ہے کہ ایک صحابی غلطی کرے تو آپ اسے غنڈہ قرار دیتے ہیں[33] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر سورۂ نور میں زانی کو زانی غیر محصن قرار دیں تو آپ اس کی تغلیط کرتے ہیں[34] اور آپ کے

شاگردِ رشید کہتے ہیں کہ "اگر یہاں زانی کو زانی غیر محصن کہا جا سکتا ہے تو پھر گدھے کو گھوڑا اور گائے کو بیل بھی کہا جا سکتا ہے"۔[۳۵] ہم کہتے ہیں کہ یہ جناب رسالت مآب (فداہ ابی وامی) کے حضور سوءِ ادب اور گستاخی ہے جو اشتعال انگیز ہے (اور ہمیں ڈر ہے کہ کوئی جذباتی نوجوان ان الفاظ پر جاوید غامدی کے خلاف توہین رسالت کا مقدمہ نہ درج کرا دے)۔

سطورِ بالا میں ہم نے جو موقف اختیار کیا ہے، وہ ہمارا انفرادی جذباتی موقف نہیں ہے بلکہ صحابہ اور تابعین کے زمانے سے اہل علم کا سوچا سمجھا موقف ہے۔ چنانچہ امام دارمی نے یعلی بن حکیم سے روایت کی ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے ایک دفعہ حدیث بیان کی تو ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ یہ قرآن کے خلاف ہے تو حضرت سعید نے اس کا برا منایا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ تجھ سے زیادہ قرآن جانتے تھے[۳۶] حقیقت یہ ہے کہ اس امر کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو سنت کو منزل من اللہ اور اللہ کی طرف سے تصدیق اور تصویب شدہ نہ مانتا ہو ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسلمان قرآن کی اس تفسیر کو حتمی نہ مانے جو خود صاحبِ قرآن نے کی ہو جو خود از روئے قرآن ان کا فرضِ منصبی ہے۔[۳۷]

دوسری بات جو اس پہلے نکتے میں بیان کی گئی حقیقت کا نتیجہ اور تتمہ ہے، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی سے جذباتی محبت ہر مسلمان کا سرمایۂ ایمان ہے اور یہ اہل اسلام کی قوت کا منبع اور ان کے اتحاد اور ایک اُمت بنے رہنے کا بہت بڑا سبب ہے اور اسلام کے دشمن اس محبت کو کم کرنا اور اس تعلق کو کمزور کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان ان کے لیے تر نوالہ ثابت ہوں۔ لہٰذا اہل نظر حضور ﷺ سے اُمت کی اس محبت کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اسے بڑھانا چاہتے ہیں (جس کی ایک مثال علامہ اقبال کا طرزِ عمل ہے۔ لاہور کے ایک ان پڑھ نوجوان نے جب ایک شاتم رسول کا سر قلم کیا تو اقبال نے کہا "ہم پڑھے لکھے باتیں ہی بناتے رہ گئے اور بڑھئی لڑکا بازی لے گیا"۔[۳۸] اسی طرح جب انہوں نے قادیانیت کے خلاف بیان دیا تو نہرو نے طنزاً کہا کہ اقبال تم بھی! مطلب یہ کہ تم جیسا پڑھا لکھا اور روشن خیال شخص بھی اس طرح کے مذہبی تعصب کا مظاہرہ کرے گا، اس کی توقع نہ تھی۔ اقبال نے فوراً جواب دیا ہاں میں بھی، کیونکہ یہ امت کی بقا کا مسئلہ ہے)[۳۹]۔ جبکہ اصلاحی مکتب فکر کا حدیث کے حوالے سے موقف

منکرین سنت کی طرح حضور ﷺ سے مسلمانوں کی اس جذباتی وابستگی کو دھچکا پہنچاتا ہے۔ خبر واحد کی حجیت پر علمی بحثیں ماضی میں اُصولیوں کے درمیان ہوتی رہی ہیں لیکن اسے اپنی فکر کا مرکزی نکتہ بنانا، اسے عوام میں پھیلانا اور انہیں قائل کرنے کی جدوجہد کرنا، اس پر فخر کرنا اور اس کیلئے بعض اوقات غیر محتاط زبان استعمال کرنا، یہ سب اپنے آخری نتیجے میں رسول اللہ ﷺ سے جذباتی وابستگی کو کمزور کرنے کا سبب بن رہا ہے۔☆

تیسرے یہ کہ یہ صرف حدیث وسنت ہے جو دین اور معاشرے کی تفصیلی صورت گری کرتی ہے۔ قرآن ظاہر ہے کہ تفاصیل سے بحث نہیں کرتا۔ اس لیے اسلام دشمن قوتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح حدیث وسنت کو مسلمانوں کی نظروں میں مشتبہ قرار دیا جائے تاکہ قرآن کی من مانی تفسیر کا راستہ صاف ہو جائے۔ اس کے لیے ایک تکنیک یہ اختیار کی گئی ہے کہ قرآن کی عظمت و حاکمیت پر اس طرح اصرار کیا جائے کہ حدیث وسنت اس کے سامنے بے وقعت لگے۔ ہم کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو قرآن کی سطوت وعظمت کا قائل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، وہ زمین پر خدا کی حجت ہے، وہ کلامِ باری تعالیٰ ہے، اس کی حکومت بحروبر پر چھائی ہوئی ہے، وہ اللہ کی برہان اور منارۂ نور ہے۔ غرض قرآن کی عظمت بیان کرتے ہوئے جتنا بھی مبالغہ کر لیا جائے وہ کم ہے اور اس کے لیے جتنی بھی شاعری اور لفاظی کر لی جائے وہ صحیح اور برحق ہے لیکن اس کی قیمت یہ نہیں ہونی چاہیے کہ جس پر قرآن نازل ہوا تھا، قرآن کے نام پر اس کی سنت کو پیچھے پھینک دیا جائے اور اُمت چودہ سو

---

☆ نبی کریم سے محبت آپ کے اَقوال وافعال سے محبت، اُن کی اتباع پر منتج ہونی چاہئے۔ احادیثِ نبوی کو دین فہمی میں اہمیت نہ دینا گویا شانِ نبوت اور حبِ نبوی کا انکار ہے۔ نبی کی شریعت کے شارح کی حیثیت کو کسی امتی نے نہیں بلکہ اللہ تعالی نے قران میں واضح کیا ہے۔ صرف مسئلہ نبی کے فرمان کے صحیح طور پر ثابت ہوجانے کا ہے۔

یہاں اس مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہئے کہ شریعت دورِ نبوی میں اور آج تک بالکل ایک ہی رہی ہے، ایسا نہیں کہ کوئی امر صحابہ کے لئے تو شریعت ہو اور ہمارے لئے نہ ہو، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ کا دین صحابہ اور ہمارے لئے یکساں نہیں۔ ایک بات جسے نبی کریم اپنے صحابہ سے فرمائیں تو وہ تو اس کو ماننے کے مکلّف ہوں، لیکن ہم مرورِ زمانہ کے بعد اس کے پابند نہ رہ جائیں، کیونکر ایسے ہوسکتا ہے!!؟ (محدث)

سال سے جن احادیث کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر ان پر عمل پیرا اور ان کے تقدس کی قائل ہے، قرآن فہمی کے نام پر ان کو بے وقعت کر دیا جائے۔ ظاہر ہے یہ موقف اسلام دشمنوں کو تقویت دینے والا ہے !!

قرآن فہمی میں حدیث وسنت کے کردار کے حوالے سے اپنی گزارشات ختم کرتے ہوئے☆ ہم مولانا عبدالغفار حسن سے درخواست کرتے ہیں، جن کا مضمون ان گزارشات کا باعث بنا کہ وہ ان مسائل میں اپنے موقف کی وضاحت کریں، اگر وہ ان امور میں مولانا اصلاحی کے افکار کی حمایت کرتے ہیں تو اہل علم کے سامنے اپنے دلائل رکھیں اور اگر وہ انہیں صحیح نہیں سمجھتے تو ان سے اعلانِ برأت کریں تاکہ بات عام مسلمانوں پر واضح ہو جائے۔

(شائع شدہ ماہنامہ محدث لاہور، اگست ۲۰۰۱ء)

## حوالہ جات


① مولانا امین احسن اصلاحی، مبادئ تدبر حدیث، باب اوّل و دوم خصوصاً ص ۱۹، ۲۸، ۳۸، ۴۱، فاران فاؤنڈیشن لاہور، ۲۰۰۰ء ...... مولانا امین احسن اصلاحی، مبادئ تدبر قرآن، ص ۵۲، ۱۶۹ و مابعد، دارالاشاعت الاسلامیہ لاہور، ۱۹۷۱ء ...... مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، جلد اوّل مقدمہ، ص ب و مابعد، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۱۹۷۶ء

② صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والادب، باب رغم من أدرک ابویہ، ص ۱۱۲۵، دارالسلام الریاض ۱۹۹۹ء

③ آلِ عمران ۳:۴۵

④ ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۴ ص ۳۵۸، دارالصادر، بیروت

⑤ اصلاحی، مبادئ تدبر حدیث، ص ۲۸

⑥ مبادئ تدبر حدیث، ص ۲۷

⑦ ایضاً: ص ۲۹

⑧ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، باب لا یشهد علی شهادة جور اذا اشهد، ص ۲۰۹، دارالسلام الریاض، ۱۹۹۹ء

⑨ مبادئ تدبر حدیث، ص ۲۸

⑩ مبادئ تدبر حدیث، ص ۲۸

⑪ مبادئ تدبر حدیث، ص ۳۸ و مابعد

⑫ اصلاحی، مبادئ تدبر قرآن، ص ۱۴۵، ۱۴۷

⑬ مبادیٔ تدبر قرآن، ص ۱۴۸
⑭ السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۳ر ص ۲۰۷، طبع تہران
⑮ امام شافعی، احکام القرآن، ج ا ص ۲۸ و مابعد، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۳۹۵ھ
⑯ امام ابن تیمیہ، اصولِ تفسیر (اردو ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی) ص ۸۷، مکتبہ سلفیہ لاہور، ۱۹۶۳ء
⑰ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج ا ص ۳۷ و مابعد، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۷۲ھ
⑱ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ار ص ۳، سہیل اکیڈیمی لاہور ۱۹۷۲ء
⑲ آلوسی، روح لمعانی، ج ا ص ۶، مکتبہ امدادیہ، ملتان
⑳ ابن تیمیہ، اصول تفسیر، ص ۸۷
㉑ الشاطبی، الموافقات، ج ۴ ص ۲۰، دارالمعرفہ بیروت
㉒ راغب اصفہانی، مقدمہ تفسیر ص ۶۰۶، نور محمد اصح المطابع کراچی
㉓ سنن دارمی، ۲۶ باب السنۃ قاضیۃ علی الکتاب، ج ا ص ۱۴۵ مطبعہ الاعتدال دمشق، ۱۳۴۹ھ
㉔ خطیب بغدادی، الکفایہ فی علم الروایہ، ص ۱۶، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۷ھ
㉕ سنن دارمی، ج ا ص ۱۴۵
㉖ خطیب بغدادی، الکفایہ، ص ۱۶
㉗ العسقلانی، تہذیب التہذیب، ج ۱۰ ص ۲۸۹، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۵ھ
㉘ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ا ص ۱۰۱، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۲ھ
㉙ تہذیب، ج ۱۱ ص ۲۶۸
㉚ الخزرجی، خلاصہ تذہیب الکمال، ص ۳۶۷، مطبع الخیریہ القاہرہ، ۱۳۲۲ھ
㉛ اصلاحی، مقدمہ تدبر قرآن، ص ح ...... مبادیٔ تدبر قرآن، ص ۱۷۳ و مابعد
㉜ ابن تیمیہ، اصول تفسیر ص ۸۳، ۸۴
㉝ اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۴، ص ۵۰۵ و مابعد
㉞ اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۴، ص ۵۰۱ و مابعد
㉟ جاوید غامدی، میزان، ص ۱۴۳ و مابعد، دارالاشراق لاہور، ۱۹۷۵ء
㊱ سنن دارمی، ج ا ص ۱۴۵
㊲ النحل، ۱۶: ۴۴، الجمعہ ۶۲/۲
㊳ محمد اسماعیل قریشی، ناموس رسولؐ اور قانون توہین رسالت، ص ۴۰۷، الفیصل ناشران کتب لاہور، ۱۹۹۹ء
㊴ مرزائیت کے متعلق جواہر لعل نہرو کے جواب میں علامہ اقبال کا بیان، شعبہ اشاعت وتبلیغ لاہور، ۱۹۳۶ء

# قرآن فہمی میں تعامل اُمت کا کردار

ڈاکٹر سہیل بن عبد الغفار حسن

سابقہ مضمون [ص ۱۱۳ تا ۱۳۵] میں ڈاکٹر محمد امین نے والد محترم کے مضمون 'قرآن فہمی کے بنیادی اُصول' میں سے 'تعامل اُمت' کے نکتہ پر تنقید فرمائی ہے۔

اُن کی اس تنقید میں کئی اُمور قابل غور ہیں:

① اُصولِ نقد کے مطابق والد محترم کے مضمون کا وہ حصہ نقل کیا جانا چاہئے تھا جس پر یہ اعتراضات کئے جا رہے ہیں، تاکہ قاری کے سامنے اصل عبارت ہو اور وہ خود فیصلہ کر سکے جبکہ دونوں مضامین کی اشاعت میں کئی ماہ کا فرق ہے۔

② ڈاکٹر صاحب نے (مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے نقطہ نظر تواتر عملی 'تعامل اُمت' سے والد محترم کے لفظی اشتراک کو دیکھ کر تنقید شروع کر دی جبکہ ضروری تھا کہ دونوں حضرات کے ہاں تعامل اُمت کے مفہوم کو متعین کرنے کے بعد اتفاق یا اختلاف بیان کرتے۔ والد محترم فرماتے ہیں:

> ''تعامل سے مراد ہے عہدِ نبویؐ سے لے کر صحابہؓ کے دور میں، تابعین کے دور میں، محدثین اور فقہا کے دور میں اس پر کیسے عمل کیا گیا؟ مفسرین کے دور سے لے کر اب تک جو بات لوگوں میں دین کے نام سے رائج چلی آ رہی ہے، وہ قرآن کے لئے بہترین تفسیر ہے۔ یہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری سے لے کر اب تک جو رسم و رواج اور بدعات رائج ہوگئیں، ان کو ہم تعامل اُمت کہہ دیں۔ وہ تعامل اُمت نہیں کہلائی جا سکتیں۔'' (کتاب ہذا کا صفحہ نمبر ۶۶)

اس عبارت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعامل اُمت سے مراد وہ اعمال ہیں جو ان حضرات سے تواتر سے منقول ہیں اور یہ نقل صرف روایت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔اور دوسری

بات یہ کہ جو چیز روایت سے ثابت نہیں ہے، وہ بدعت شمار ہوگی اور اسے ہم تعامل اُمت نہیں کہہ سکتے۔

③ ڈاکٹر محمد امین صاحب اصل مقصود کو سمجھے بغیر والد محترم کے کلام سے استنباط فرماتے ہیں:

''گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلی چھ صدیوں میں جو بدعات مروج ہوئیں وہ تو حق ہیں اور جو بعد میں ہوئیں، وہ قابل قبول نہیں۔''

یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص بعد کی بدعات کو غلط کہتا ہو، وہ پہلے کی بدعات کو صحیح سمجھے گا۔ جب کہ یہ مقصود نہیں ہے اور جہاں تک ساتویں صدی تک کا ذکر ہے وہ مثال کے طور پر تذکرہ کیا گیا کہ میلاد کی بدعت کا رواج اسی زمانے☆ میں ہوا اور اس کے ساتھ مزید بدعات جڑ پکڑتی چلی گئیں۔

اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ والد محترم روایت کو تعامل کے سمجھنے کا ذریعہ مانتے ہیں کہ اُمت کے تعامل سے احادیث کے مضمون کی تائید ہوجاتی ہے اور اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوجاتی ہے، جبکہ اصلاحی صاحب کا موقف یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ انہوں نے یہ مضمون اصلاحی صاحب کے افکار و نظریات کے ردّ میں تحریر کرنا تھا لیکن لفظی اشتراک کو دیکھتے ہوئے والد محترم کو بھی اسی لاٹھی سے ہانک دیا۔

④ والد صاحب کے نزدیک تعامل اُمت سے مراد حقیقت میں وہ 'خبر' ہے جو تواتر کا درجہ رکھتی

---

☆ ڈاکٹر محمد امین نے میلاد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تیسری صدی ہجری میں ایجاد ہوا جب کہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے ایک رسالہ میں ہے: وأول من ابتدعها فيما بلغناهم هم الفاطميون في القرن الرابع الهجري اور اس کی تائید مقریزی کے کلام سے ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب المواعظ والاعتبار: ۱/۴۹۰ میں فاطمیوں کی اَعیاد میں 'مولد' کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ بعض لوگوں نے ابن خلکان کی 'وفیات الاعیان' کی روایت کے مطابق کہا ہے کہ یہ ساتویں صدی کا واقعہ ہے۔

بہرحال اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بدعت تیسری صدی میں ایجاد نہیں ہوئی بلکہ یہ چوتھی صدی یا اس کے بعد کی ایجاد ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے:

شیخ اسمٰعیل بن محمد انصاری کی کتاب القول الفصل فی حکم الاحتفال بمولد خیر الرسل ﷺ

ہے، جیسا کہ والد محترم کے دوسرے مضمون 'حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم' میں وضاحت کی گئی ہے:

''خبر متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ہر دور میں اتنے زیادہ رہے ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہوجانا ناممکن ہو۔''

اس کے بعد وہ تواتر کی مختلف صورتیں بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اب یقین کے مختلف مراتب اور ظن کی مختلف صورتوں کے اعتبار سے حدیث کی حسب ذیل اقسام ہیں: (۱) ایسے عملی مسائل پر مشتمل 'احادیث' جو اُمت میں شروع سے اب تک بغیر کسی اختلاف کے ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوتی رہی ہیں، مثلاً اذان و اقامت کے کلمات، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، اور عصر کی چار رکعتیں، رکوع و سجود کی تعداد، اس قسم کے بیسیوں اُمور وہ ہیں جو حدیث کی مستند کتابوں میں درج ہیں☆ اور ان کی تائید

---

☆ محدثین کے ہاں واقعات کی تحقیق کے لیے دو رستے ہیں: ایک زمانوں کا تسلسل عمل (تعامل اُمت) دوسرا اس خبر کی روایت (حدیث)۔ دورِ حاضر میں اسے تحریری اور غیر تحریری دستور و رواج سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے مثلا برطانیہ کا دستور غیر تحریری ہے تو فرانس کا تحریری۔ ظاہر ہے کہ غیر تحریری روایات میں لوگوں کا اختلاف ہو جاتا ہے تو نزاع عدالت کے سپرد ہو جاتا ہے پھر جو رواج عدالت کے فیصلہ سے تعین پا جائے، اسے قانون Common Law کا درجہ دے دیا جاتا ہے، یعنی تعامل (رواج) کو فیصلہ کن حیثیت اس عدالتی تحقیق سے ملتی ہے۔ پاکستان وغیرہ میں اسی بنا پر اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے قانونی نظیر کے طور پر دستور کی حتمی تعبیر سمجھے جاتے ہیں۔ محدثین نے خیر القرون (صحابہ، تابعین اور تبع تابعین) کے تعامل سے روایاتِ حدیث میں بڑا فائدہ اُٹھایا ہے کیونکہ مجموعی طور پر ان زمانوں میں نبوی معاشرہ کے اثرات غالب رہے لیکن جب بھی کسی عمل کے تسلسل میں ذرا بھر فرق محسوس ہوا، اس کی روایت سے ہی اس کا تحفظ ہوتا رہا۔ گویا تعامل کے اختلاف کا حل روایت کے ذریعے کیا جاتا رہا۔ لہٰذا روایاتِ حدیث، تعامل اُمت کی محافظ ہیں جنہیں تسلسل زمانہ پر مُہیمن بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن تسلسل زمانہ کو روایاتِ احادیث پر مہیمن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تفصیل کیلئے ماہنامہ محدث کے فتنۂ انکارحدیث نمبر بابت ستمبر ۲۰۰۲ء میں شائع شدہ مضمون دیکھیں: 'حفاظتِ حدیث کے مختلف ذرائع' (ص ۱۵۰ تا ۱۵۵) از حافظ عبدالرحمٰن مدنی

اصلاحی صاحب نے 'روایت' کی چڑ سے تعامل و تسلسل کو 'تواترِ عملی' اور 'سنت' کی من گھڑت اصطلاحات سے بیان کر کے فضول سا فن حدیث قرار دیا اور 'تدبرِ حدیث' کے نام سے جدید نظام تعلیم کے پروردہ اور 'دین سے نابلد' نوجوانوں پر دھاک بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عبدالغفار حسن نے تعامل اُمت کو اخبار ←

میں پوری اُمت کا تعامل (عملدرآمد) بغیر کسی شائبہ اختلاف کے موجود ہے۔

سنت وحدیث کا یہ وہ سرمایہ ہے جس کا یقینی پہلو قرآنِ مجید کے کلام الٰہی ہونے کی طرح محکم اور مضبوط ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے کاتبوں اور حافظوں کی تعداد اگر ہر دور

---

➡ وروایات کی تائیدِ مزید کے طور پر ہی اپنی بعض تحریروں میں ذکر کیا ہے۔ اصلاحی صاحب سے محترم موصوف کے ایک خاص تنظیمی تعلق کی بنا پر بعض حضرات مغالطہ کا شکار ہو گئے ہیں کہ وہ بھی خبر کی روایت پر تعامل کے مُھیمن ہونے کے قائل ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

وہ 'خبر وحدیث' کی روایت اور اس کی محدثانہ تحقیق (جسے درایت کہا جاتا ہے) پر ہی زور دیتے ہیں اور اس کی حجیت کے قائل ہیں۔ ان کا مضمون 'حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم' اس پر دلیل ناطق ہے، البتہ اس مغالطہ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے محدثین کی طرح خیر القرون کے تعامل کو محدود نہیں رکھا بلکہ تعامل اُمت کو دور حاضر تک کھینچ لائے ہیں جبکہ خیر القرون کے بعد روایاتِ حدیث کے سلسلہ میں محدثین نے تعامل کو اہمیت نہیں دی، تاہم فقہا دین وشریعت کی اجمالی شکلوں پر 'اتفاق واِجماع' کے ضمن میں تعامل اُمت کا نکتہ بھی لے آتے ہیں۔ دراصل حدیث وفقہ کے فنون الگ ہو جانے کے بعد حدیث کی تحقیق کی بحث میں یہ نکتہ رسی التباس کا باعث ہوگئی ہے۔

ہم ڈاکٹر سہیل حسن صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے حضرت موصوف کی طرف سے وضاحت فرما کر اس التباس کی وضاحت کردی۔ محترم ڈاکٹر محمد امین صاحب بھی شاید اسی وجہ سے 'ردّ عمل' کا شکار ہوئے ہیں بلکہ وہ اپنے مضمون میں ایک ہی قلم سے اصلاحی صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن کے درمیان 'محدثین کے خیر القرون کے تعامل' کو بھی رگڑا دے گئے ہیں۔ ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''گویا ان کا مطلب یہ ہے کہ پہلی چھ صدیوں میں جو بدعات مروج ہوئی وہ تو حق ہیں اور جو بعد میں ہوئیں وہ قابل قبول نہیں۔ اصلاحی صاحب کو تواترِ عملی کے لیے دلیل لانا پڑی تو وہ عہدِ صحابہ تک رک گئے۔ محدثین نے قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم «خیرکم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم» سامنے رکھ کر معاملہ تابعین تک پہنچا دیا۔ دیکھئے مولانا عبدالغفار حسن کس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے تعامل امت کے معاملے کو ساتویں صدی تک کھینچ کر لاتے ہیں؟'' (کتاب ہذا کا صفحہ نمبر ۱۲۰)

واضح رہے کہ محدثین کے ہاں حدیث کی تین اقسام: مرفوع (نبیؐ سے منسوب) موقوف (صحابی کا قول وعمل) اور مقطوع (تابعی کا قول وعمل) خیر القرون کے تعامل کی اہمیت پر ہی دلالت کرتی ہیں لیکن محدثین اصلاحی صاحب کے برعکس تعامل خیر القرون کی تعیین بھی روایتِ حدیث سے کرتے ہیں نہ کہ حدیث پر تعامل کو مھیمن قرار دیتے ہیں۔ درایتِ حدیث کا میدان 'اصلاحی حلقہ فکر' کی اپروچ سے بہت بالا ہے۔ انہیں کسی نام نہاد عقلیت یا ذہانت کے پندار سے محدثین کی کاوشوں پر رندہ پھیرنے کی جسارت' سے باز رہنا چاہیے۔ (محدث)

میں لاکھوں رہی ہوگی تو نمازیوں اور روزے رکھنے والوں کی گنتی کروڑوں سے کم نہ ہوگی۔
تواتر اور راویوں کی ان گنت تعداد کے لحاظ سے حدیث کا یہ سرمایہ قرآن ہی کی طرح یقینی ہے، اس کا انکار خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے، حدیث کا یہ سرمایہ شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے اعتبار سے حق الیقین کا مقام رکھتا ہے۔'' (محدث، شمارہ اگست ۲۰۰۱ء: صفحہ ۱۶)

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ والدِ محترم تعامل اُمت کو روایات اور احادیث سے مربوط کرتے ہوئے اسے سنت و حدیث کا سرمایہ قرار دے رہے ہیں۔ حدیث اور سنت کو الگ الگ دو چیزیں بتانے کی بجائے ایک چیز مان رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ 'بے خیالی میں' یا 'غیر شعوری طور پر متاثر ہوگئے ہوں' اور اصلاحی صاحب کی رائے اپنا لی ہو، جبکہ وہ اپنے مضامین میں اصلاحی صاحب کے نظریات پر خصوصاً حدِ رجم کے حوالے سے سخت تنقید کر چکے ہیں۔

ان گذارشات کی روشنی میں والدِ محترم سے اعلانِ براءت کا مطالبہ یا رجوع کی فرمائش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ ان معروضات کو پڑھنے کے بعد والدِ محترم کے دونوں مضامین کا دوبارہ مطالعہ کریں تو ان پر حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گی۔

للهم نتِي لحق حقتِي عَلَى قنتِي تبتِيعه عَلَى نتِي لبتِيطل بتِيطلا عَلَى قنتِي

# قرآن نافہمی کے اَسباب اور اس کا حل

قرآنِ کریم عربی زبان میں نازل ہوا اور دنیا میں شاید عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ترجمہ کے بغیر پڑھائی جاتی ہے۔ بچہ جب پہلی جماعت سے انگریزی پڑھنا شروع کرتا ہے تو استاد اسے بتلاتا ہے: A سے "APPLE"، "Apple" بمعنی 'سیب' اسی طرح فارسی پڑھنے والے بچے کو 'آب' اور 'است' ہی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ 'آب' بمعنی 'پانی' اور 'است' کے معنی 'ہے'...... لیکن جو بچے عربی پڑھتے ہیں، انہیں صرف الفاظ ہی پڑھائے جاتے ہیں۔ الفاظ کے معانی کا خیال کسی کو بھولے سے بھی نہیں آتا۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمیں یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا ہی باعثِ برکت ہے۔ دلیل کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے:

''قرآنِ کریم کے ہر حرف کے بدلے ایک نیکی ملتی ہے اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ملے گا۔ میں نہیں کہتا کہ الٓمّ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے ل الگ حرف ہے اور م الگ حرف!'' (ترمذی)

اس سے ہم عامیوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر قرآن کریم کو ناظرہ پڑھنے سے ہی اتنی زیادہ نیکیاں مل جاتی ہیں تو پھر ترجمہ پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک: «خیرکم من تعلّم القرآن وعلّمه» ''تم میں سے بہترین وہ ہے جو خود قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھلائے'' سے بھی ہم نے یہی سمجھ لیا کہ بس قرآنِ کریم ناظرہ پڑھنے پڑھانے سے ہی آپ کے ارشاد کی کما حقہ تعمیل ہوگئی۔

لیکن معاملہ یوں نہ تھا جو ہم غلطی سے سمجھ بیٹھے۔ قرآنِ کریم جو عربی میں نازل ہوا ہے،

صرف اہل عرب کے لئے نہیں، پوری دنیائے انسانیت کے لئے نازل ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے مذکورہ بالا ارشاد کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، قرآنِ کریم پڑھنے کا زیادہ سے زیادہ شوق اور اس کی رغبت پیدا ہو۔ اور اہل عجم محض اس خیال سے کہ ابھی وہ قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب نہیں سمجھتے، قرآن کریم کی تلاوت سے بھی غافل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس ناظرہ پڑھنے کی ترغیب کا یہ فائدہ ہوا کہ ان مسلمانوں کے دلوں میں قرآنِ کریم کے معانی و مطالب بھی جلد از جلد سیکھنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور انہوں نے نہ صرف دینی تعلیم کے حصول کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے شریعت کے ہر ہر پہلو پر ایسا قیمتی ذخیرہ بھی کتابوں کے اَوراق میں محفوظ کر دیا کہ ان کے اس احسان سے ہم شاید کبھی بھی سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک جامع تھا، ہمارے بزرگوں نے اس کی حقیقت کو پہچان لیا اور اس پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ لیکن ہم اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور نتیجتاً قرآنِ کریم کی تعلیمات سے دور ہٹتے چلے گئے۔

اگر بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو بھی مسلمانوں میں ہمہ پہلو انحطاط رونما نہ ہوتا، علماءِ حق عوامی جہالت کے اس خلا کو ملکی زبان میں تبلیغ کے ذریعہ پر کر سکتے تھے لیکن ستم یہ ہے کہ اس قرآن نافہمی کے اور بھی بہت سے اَسباب پیدا ہو گئے اور یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ یہ اسباب ان لوگوں کے پیدا کردہ ہیں، جنہیں ہم دین اسلام کی 'بزرگ' ہستیاں سمجھتے ہیں۔ آج ہم انہی اسباب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں:

## پہلا سبب: قرآنِ کریم کو مشکل ترین کتاب سمجھ لینا

قرآنِ کریم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾(القمر:١٧)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ سوچے اور سمجھے؟''

قرآن کریم کو آسان اس لئے بنایا گیا کہ یہ کتاب اَن پڑھ لوگوں پر نازل ہوئی۔ ارشادِ

باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ﴾ (آل عمران:۲۰)

"(اے پیغمبر ﷺ!) اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہو (کہ کیا تم بھی خدا کے فرمانبردار بنتے اور) اسلام لاتے ہو۔"

دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾

"اور ہم نے آپ پر (ایسی) کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے اور وہ مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔" (النحل:۸۹)

قرآنِ کریم کا اصل موضوع "انسان کی ہدایت" ہے، لہٰذا ہدایت سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات اس کتاب میں پوری تفصیل سے بیان کردی گئی ہے اور یہ ذکر ٹھیٹھ عربی زبان میں ہے، تاکہ عوام وخواص سب لوگ اس سے برابر فائدہ اٹھا سکیں۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء:۱۹۲تا۱۹۵)

"یہ قرآن پروردگار کا اتارا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ آپؐ کے دل پر تاکہ آپ لوگوں کو ڈرائیں اور یہ قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔"

پھر اس ٹھیٹھ عربی زبان میں کوئی اُلجھن یا پیچیدگی بھی باقی نہیں رہنے دی گئی، فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (الکہف:۱)

"سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب اُتاری اور اس میں کسی طرح کی کجی اور پیچیدگی نہ رکھی۔"

مزید برآں ہدایت کے ان جملہ اُمور کو کئی طرح کی مثالوں سے اور مختلف انداز سے دہرایا اور بیان فرمایا گیا ہے تاکہ کسی شخص کے ذہن میں کوئی اُلجھن یا شک وشبہ نہ رہنے پائے اور وہ ان اُمور کے جملہ پہلوؤں کو آسانی سے ذہن نشین کرسکے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ﴾ (الانعام:۶۵)

"دیکھو! ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح سے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ سمجھ سکیں۔"

لیکن ہمیں یہ بات باور کرا دی گئی ہے کہ قرآنِ کریم ایک مشکل ترین کتاب ہے اور اس کو سمجھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے، لہٰذا عام لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ کسی عالم دین کی اِتباع اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن عام لوگوں کے لئے اُتارا اور سہل زبان میں نازل کیا تھا لیکن ان ارشادات کے برعکس قرآن کو عوام کے ذہن سے بالاتر اور مشکل ترین کتاب قرار دے دیا گیا اور اس کا ثبوت آپ کو دینی مدارس میں مروّجہ نصاب سے مل جائے گا۔ آپ کسی بھی دینی مدرسہ کے نصاب تعلیم پر نظر ڈالیے، آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم پڑھنے پڑھانے کی نوبت سب سے آخری سال آتی ہے۔ اگر کسی مدرسہ کا نصاب تعلیم ۶ سال کا ہے تو تفسیر قرآن کا موضوع چھٹے سال، اور اگر ۹ سال کا ہے تو نویں سال پڑھایا جاتا ہے۔ پہلے سالوں میں علی الترتیب صرف، نحو، منطق، اَدب اور فقہ وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اختتامی سال سے ایک سال قبل کو دورۂ حدیث اور آخری سال کو قرآنِ کریم کی تعلیم کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ ایسے مجوزہ نصابِ تعلیم کی مصلحت خواہ کچھ بھی ہو، ایک عام آدمی یہی تاثر لیتا ہے کہ قرآنِ کریم شاید ان تمام کتابوں سے مشکل ترین کتاب ہے جبھی تو اس کی نوبت سب سے آخر میں آتی ہے۔

## تقلیدِ جامد

قرآنِ کریم کو سب سے آخر میں پڑھانے کی جو مصلحت بیان کی جاتی ہے، اس سے یکسر انکار کرنا مشکل ہے لیکن تکلیف دہ امر یہ ہے کہ حقیقتاً جس مصلحت کے لئے قرآنِ کریم کو آخر میں ڈالا گیا ہے، وہ کچھ اور ہے اور اسے پردۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ یہ مقصد عقیدۂ تقلید کی حفاظت ہے۔ مقلدین کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قرآن وسنت کو اپنے امام کی فقہ کی عینک سے دیکھا جائے۔ پہلے طالب علم کو فقہ کی تمام متعلقہ کتب پڑھا لی جاتی ہیں اور جب اس کے ذہن میں فقہ کی چھاپ لگ جاتی ہے تو وہ قرآن وسنت سے نتائج اَخذ کرنے میں وہی روِش اختیار کرتا ہے جو اس کے نصابِ تعلیم کی ترتیب کا منطقی نتیجہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ وہ اپنے امام سے ہٹ کر کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہتا اور اگر کہیں اسے الجھاؤ یا تضاد نظر آتا بھی ہے تو وہ اس کی تحقیق کی ذمہ داری اپنے امام کے سر ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ تقلید کی تعریف ہی یہ

کی جاتی ہے:"والتقلید قبول قول غیر بلا دلیل فکانه جعل قلادة فی عنقه
"تقلید کسی کے قول کو بغیر دلیل کے قبول کر لینے کا نام ہے۔ گویا کہ مقلد نے اپنی گردن میں اس کی اطاعت کا پٹہ ڈال لیا۔" (شرح قصیدہ امالی از ملا علی قاری حنفی)

اس تعریف سے واضح ہے کہ مقلدین ذہنی طور پر اپنے امام کو امام نہیں بلکہ پیغمبر سمجھتے ہیں کیونکہ پیغمبر ہی ایک ایسی ہستی ہو سکتی ہے جس کی بات بلا دلیل قبول کی جائے۔ پیغمبر کے علاوہ کوئی اور ہستی معصوم اور خطا سے پاک نہیں ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس تحقیق کی ذمہ داری امام کے سر ڈالی جاتی ہے وہ خود اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہیں، ہمارے ہاں زیادہ تر حنفی مذہب ہی رائج ہے اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ "جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے"!...... بلکہ آپ نے یہاں تک کہہ دیا کہ

"اگر حدیث مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر پٹخ دو۔"

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے معروف شاگردوں امام محمد اور امام زُفر نے بہت سے مسائل میں آپ سے اختلاف کیا لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ امام موصوف کے ان اَقوال کے باوجود ان کے مقلدین، حدیث کی تو دوراَز کار تاویلات میں مشغول ہو جاتے ہیں یا اس کی ذمہ داری امام کے سر ڈال کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں لیکن اپنے امام کے قول کو چھوڑنا انہیں قطعاً گوارا نہیں ہوتا۔

اگر فقہ سے پہلے قرآن و حدیث پڑھایا جائے تو طالب علم کے ذہن میں پہلی چھاپ قرآن و حدیث کی ہوگی۔ مسائل کے حل اور نتیجہ نکالنے میں وہ فقہ سے مدد تو لے گا لیکن عملاً مقلد نہیں رہ سکتا، لہٰذا تقلید کے عقیدہ کی حفاظت کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم سب سے آخر میں رکھی جائے۔

فقہ کی تالیف کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا قیاس اور اجتہاد کے ذریعہ صحیح حل تلاش کیا جائے۔ ائمہ فقہاءؒ نے اس مقصد کے پیش نظر اپنے اپنے دور میں فقہ کو مرتب کیا اور اس دور کے مسلمانوں نے بھی یہی کچھ سمجھا۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے آئندہ اجتہاد کو شجر ممنوع قرار دے کر ہر چہار ائمہ فقہ میں سے کسی ایک کی اِتباع

کو اِسلام کا جزو بنا دیا۔ پانچویں صدی ہجری میں یہ عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ جو شخص مخصوص اِمام کا مقلد نہ ہوتا، اسے بطور گالی یہ کہا جاتا تھا کہ وہ چاروں مذاہب سے باہر ہے، بالفاظِ دیگر اس کا اسلام ہی مشکوک ہے۔

اس جامد تقلید نے مسلمانوں کے حواس معطل کر دیئے۔ قرآن و حدیث کو پڑھنے پڑھانے اور اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی کو ختم کر دیا گیا تو اس کی صلاحیت کہاں باقی رہتی؟ اس صورتحال کا نقشہ پروفیسر محمد سلیمان اظہر (بحوالہ تاریخ فرشتہ) سیرت محمد بن عبدالوہاب میں یوں کھینچتے ہیں:

"عربی سے صرف چند لوگ ہی آشنا تھے اور انہوں نے جاہل عوام کو بھیڑوں کا گلہ بنائے رکھنے کے لئے عربی میں موجود اسلامی اُمور پر اِجارہ داری قائم کر رکھی تھی، ملکی زبان میں کتاب و سنت کے نہ تراجم تھے نہ شروحات، لوگ کبھی کبھی قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن اس میں کیا لکھا ہے، اس سے سراسر نا آشنا تھے۔ تقلید و جمود کی بندشیں اس قدر مضبوط ہو چکی تھیں کہ ایک مناظرہ میں خواجہ نظام الدین اولیاء نے جب اپنی تائید میں ایک روایت بطورِ استدلال پیش کی تو ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ خواجہ رکن الدین صاحب نے کہا: میں بھی مقلد ہوں اور آپ بھی مقلد ہیں۔ اس لئے حدیث کی کیا ضرورت ہے، امام ابوحنیفہؒ کا قول پیش فرمایئے۔"

ظاہر ہے کہ ایسا عقیدہ قرآن وسنت کے یکسر منافی ہے۔ صحابہ اور تابعین آخر کس امام کے مقلد تھے؟ جبکہ فقہ کی تدوین ہی بہت بعد میں ہوئی۔ نیز آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ کے مصداق دین کی تکمیل بہت پہلے ہو چکی تھی اور اسلام مکمل صورت میں موجود تھا۔

بایں ہمہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تا قیامت اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے لہٰذا تاریک سے تاریک دور میں بھی علماءِ حقہ کی ایک جماعت نے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل ہو، قرآن و سنت کو سینہ سے لگائے رکھا اور باطل سے برسر پیکار رہی، حقیقتاً یہی جماعت اہل سنت تھی، جو بعد میں اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوئی۔ اہل سنت والجماعت کا لفظ ابتداًء اہل تشیع کے مقابلہ میں استعمال ہوا۔ شیعہ حضرات کے سوا باقی تمام مسلمان اپنے آپ کو اپنے اماموں سے منسوب کرنے لگے۔ یہ لوگ اختلافی مسائل میں اپنے اماموں کی رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے

تھے۔ لہٰذا مقلد اور اہل الرائے کہلائے، اور جو مسلمان کسی خاص امام کے مقلد نہ تھے، وہ غیر مقلد اور اہل الرائے کے مقابلہ میں اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوئے۔ گویا نام کو تو یہ سب مسلمان اہل سنت تھے مگر عملاً اہل سنت یہی اہلحدیث رہ گئے۔ یہ جماعت دینی مدارس میں رائج درس نظامی کی اس 'مصلحت' سے خوب واقف تھی، لہٰذا اس کے خلاف صداءِ احتجاج بلند کرتی رہی۔ جناب حافظ نذر محمد صاحب پرنسپل شبلی کالج، لاہور اپنی تصنیف ''مدارسِ عربیہ کا جائزہ'' میں ''درسِ نظامی میں اصلاحات کی تجاویز'' کے تحت صفحہ ۶۰۷ پر یوں رقم طراز ہیں:

> ''درسِ نظامی پر بیرونی حلقوں سے مسلسل یہ اعتراض رہا ہے کہ مدارسِ اہلحدیث کے علاوہ باقی تمام مدارس میں قرآن حدیث کو صرف آخری سالوں میں سبقاً سبقاً پڑھایا جاتا ہے حالانکہ دین کے یہی اصل الاصول ہیں، کسی نہ کسی نہج پر ان کا مطالعہ ابتداء سے شروع ہونا چاہئے۔''

## دوسرا سبب: پیرانِ عظام کے مخصوص نظریات

**(الف) ولایت کا معیار:** اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اسلام زیادہ تر صوفیاءِ کرام کے ذریعہ سے ہی پھیلا۔ یہ لوگ خود عموماً عالم باعمل تھے لیکن بعد میں آنے والے جانشین قرآن وسنت کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے اور اس کی وجہ غالباً وہی ہے جو پہلے ذکر کی جاچکی ہے۔ ولایت کا معیار کرامات اور خوارقِ عادات واقعات قرار پاگئے اور یہی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی سب سے بڑی دلیل ہے، کرامات کے ظہور کے لئے دیندار اور متقی ہونا تو کجا، مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ ہندوؤں کے جوگیوں اور سادھوؤں سے بھی ایسی کرامات اور خوارقِ عادات واقعات کا ظہور اکثر ہمارے اولیاءِ کرام کے تذکروں میں موجود ہے یہی ہندوانہ تاثر مسلمانوں نے بھی اپنایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ آیت بھی چسپاں کردی: ﴿اَلاَ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لاَ خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلاَ هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس:۶۲)

''سن رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔''

لیکن علم کی کمی کی وجہ سے یہ خیال کسی کو بھی نہیں آتا تھا کہ قرآنِ کریم جن لوگوں کو 'اولیاءٗ' کہتا ہے، ان کے اوصاف کیا ہیں؟ کیا وہ اولیاء یہی لوگ ہیں، جو خوارقِ عادت واقعات کے حصول کے لئے قبروں پر مراقبے کرتے اور مختلف قسم کی چلہ کشی کو اپنا رویہ بناتے

ہیں؟ شریعت میں تو سرے سے مزاروں کا وجود، مراقبے اور چلہ کشی ہی ممنوع ہے، تو پھر یہ لوگ اولیاء کیسے ہوگئے؟ اس کے برعکس قرآنِ مجید ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دوست قرار دیتا ہے جو مؤمن، متبع شریعت ہوں، تقویٰ کے درجے پر فائز ہوں، آیتِ مذکورہ بالا سے اگلی آیت یوں ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ (یونس:۶۲)

''(یعنی) وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے۔''

**شریعت، طریقت اور معرفت کا عقیدہ:** اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ مریدوں کو قرآن کی تعلیم سے ناآشنا رکھا جائے، چنانچہ مریدوں کو یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ شریعت جو قرآن و حدیث میں مذکور ہے، یہ محض ابتدائی اور سطحی درجہ ہے۔ اس سے اگلی سٹیج 'حقیقت' اور سب سے اعلیٰ درجہ 'معرفت' ہے۔ اور یہ بھی باور کرا دیا گیا کہ پیرانِ عظام 'معرفت' کے بلند تر مقام پر فائز ہوتے ہیں لہٰذا انہیں شریعت کی حدود و قیود سے پرکھنا قطعاً درست نہیں ہے۔ یہ لوگ صاحب حال ہوتے ہیں لہٰذا ان کے اَعمال و کردار کا ظاہری شریعت کے احکام سے مقابلہ کرنا ان کی شان کے خلاف ہے۔ حتیٰ کہ اگر یہ پیرانِ باصفا کسی ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے سراسر خلاف نظر آتی ہو تو بھی مرید پر لازم ہے کہ وہ بلا چون و چرا اس کی اطاعت کرتا چلا جائے۔ صرف اسی صورت میں وہ سلوک کی منازل طے کرسکتا ہے، حافظ سعدیؒ شیرازی متوفی ۷۹۱ھ نے انہی افکار ونظریات کو اپنے درج ذیل شعر میں قلم بند کیا ہے:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید ؎ کہ سالک بے خبر نبود از راہ ورسم منزل ہا

''اگر تجھے بزرگ پیر اپنے مصلیٰ کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے تو ضرور ایسا کر کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کے آداب ومراسم سے ناواقف نہیں ہوتا۔''

ظاہر ہے کہ قرآن وسنت میں ایسی بیہودہ باتوں کی کوئی گنجائش نہیں لہٰذا اگر قرآن کی تعلیم عام ہوجائے تو ان کے کاروبار پر کاری ضرب پڑتی ہے لہٰذا ان لوگوں نے عمداً یہ وطیرہ اختیار کیا کہ اپنے مریدوں کو قرآنی تعلیمات سے بے خبر رکھیں اور انہیں غفلت کی نیند سویا رہنے دیں۔

**غوث، قطب، اَبدال:** یہ بات اس سے بھی آگے بڑھتی گئی اور یہ چیز بھی عقیدہ میں شامل کردی گئی کہ اس دنیا میں ہر وقت ۳۱۳ نجیب موجود رہتے ہیں پھر ان میں سے ۷۰ نقیب ہوتے

ہیں۔ان میں سے ۴۰ اَبدال ہوتے ہیں۔ پھران میں سے ۷ قطب ہوتے ہیں،ان میں سے ۴ اَوتار اور پھران میں سے صرف ایک 'غوث' کا اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے جو ہمیشہ مکہ مکرمہ میں رہتا ہے، جب بھی اہل زمین پر کوئی ارضی یا سماوی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ نجباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نجیب یہ درخواستیں نقیبوں کو پیش کرتے ہیں اور بالآخر یہ درخواست درجہ بدرجہ 'غوث' تک پہنچتی ہے جس کا علم اللہ کے علم کے برابر ہوتا ہے اور اس کی قدرت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کم نہیں ہوتی اور وہ ان مصائب کو دور کردیتا ہے۔ العیاذ باللہ!

یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ان عقائد نے کہاں سے راہ پائی اور ان بیہودہ عقائد کے مآخذ کیا ہیں،قرآن وحدیث اور سیرت کی کتابوں میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔حضرت حسن بصریؒ جنہیں غوثِ اوّل کہا جاتا ہے تو آخر تاریخ وسیر کی کتب (انہیں غوث قرار دینے میں ) کیوں خاموش ہیں؟ پھر ان کی اقامت بھی مکہ مکرمہ میں نہ تھی، پیر عبدالقادر جیلانیؒ جو غیاث المستغیثین یا سب سے بڑے غوث سمجھے جاتے ہیں، ساری زندگی بغداد میں رہے، ان کا مولد و مدفن بھی یہی جگہ ہے تو پھر جب وہ غوث کی شرائط ہی پوری نہیں کرتے تو غوث کیونکر ہوگئے؟ ان مذکورہ دوغوثوں کے علاوہ آج تک کون کون سے غوث پیدا ہوئے اور آج کل مکہ مکرمہ میں کون صاحب غوث کے مقام پر فائز ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں، جن کا جواب ان لوگوں کے پاس بھی نہیں ہے جو اس کے دعویدار ہیں! اگر قرآن وسنت کی تعلیم عام ہوجائے تو ریت کے تودہ پر تعمیر شدہ یہ عمارات دھڑام سے زمین پر آ گرتی ہیں، لہٰذا ان غلط عقائد کا تحفظ اسی بات میں تھا کہ جاہل عوام کو قرآن وسنت کی تعلیمات کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جائے۔

**مزارات اور آستانوں کا وجود:** اس کا ایک اور پہلو مزاروں اور آستانوں کا وجود بھی ہے جو قرآنی تعلیمات عام ہونے کی صورت میں یقیناً خطرے میں پڑ سکتا ہے۔اگر آپ کو کسی مزار یا آستانے پر جانے کا اتفاق ہو تو آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہاں مشرکانہ رسوم کس کس طور پر ادا کی جاتی ہیں۔عقیدتاً لوگوں کو کیونکر گمراہ کیا جاتا ہے؟ ایسے لوگ جنہوں نے عمر بھر کبھی نماز نہ ادا کی ہو، ساتویں دن دربار کی حاضری کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ شفاعت، نجات اور جنت کے

سرٹیفکیٹ کہاں کہاں سے ملتے ہیں اور یہ عطا کنندگان کون اور کیسے لوگ ہیں؟ بے دین اور بدکار مجاوروں کو فحاشی اور بدکاری کے کیسے کیسے مواقع میسر آتے ہیں۔ بھنگ اور چرس کا دور کیسے چلتا رہتا ہے؟

اب آپ خود غور فرمایئے کہ شریعتِ مطہرہ میں ایسی باتوں کی گنجائش کہاں ہے؟ ظاہر ہے اگر 'مریدانِ باصفا' کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا دیا جائے تو اس مکروہ کاروبار کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ لہٰذا اس طبقہ نے اپنی بقا اور عافیت اسی میں سمجھی کہ عوام کو قرآنی تعلیمات سے بے بہرہ ہی رکھا جائے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

رمضان ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوگیا اور عرب کا بیشتر علاقہ اسلامی اقتدار کے زیرنگین آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسی ماہ مبارک میں جہاں عزیٰ، لات اور منات کے بتوں کو پاش پاش کرنے کے لئے علی الترتیب حضرت خالد بن ولید، حضرت عمرو بن عاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم کی قیادت میں چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ کئے، وہاں حضرت علیؓ کی قیادت میں ایک وفد اس غرض سے بھی بھیجا کہ مزارات کو منہدم کر دیا جائے اور جو قبریں زمین سے ایک بالشت سے زیادہ اونچی ہوں خواہ پختہ ہوں یا کچی انہیں بلکہ دیگر قبروں کے برابر کر دیا جائے۔'

اس کے برعکس، ہندوستان میں بہت سے ہندو، صوفیاءِ کرام کے توسط سے مسلمان ہوئے، جن کے ہاں ایسے لاتعداد آستانے پہلے سے موجود تھے اور چونکہ شرعی تعلیم کی طرف پوری توجہ نہ دی گئی لہٰذا ان نومسلموں کے فاسد اعتقادات اور افکار و نظریات میں کوئی نمایاں کمی رونما نہ ہوسکی اور رونما بھی کیونکر ہوتی۔ پہلے وہ مندروں میں بتوں کے سامنے سربسجود تھے تو اب مزارات ان کے لئے سجدہ گاہ بن گئے تھے، پہلے دیوتاؤں کے سامنے دست سوال دراز کیا جاتا تھا اب صوفیا اور پیروں نے ان کی جگہ لے لی، جن سے وہ مرادیں مانگنے لگے۔ ان حالات میں اسلام کی پابندی اور اَعمالِ حسنہ کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی تھی، لہٰذا وہ روحانی مدارج، شرکیہ وظائف، قبروں پر چلہ کشی اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہو کر رہ گئے، اس ظلمت کدہ میں شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد اَلفِ ثانی، متوفی ۱۰۳۴ھ) نے حق کی آواز بلند کی اور ان مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی، ان کی بھرپور کوششوں سے یہ فتنہ کسی حد تک دَب گیا لیکن

چونکہ قرآنِ مجید کی تعلیم کے لئے کوئی مؤثر کوشش نہ کی گئی تھی۔ لہٰذا اس فتنہ نے پھر سے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے۔ بالآخر اس مرض کی صحیح تشخیص کی سعادت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے حصہ میں آئی، انہوں نے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے قرآن مجید کا فارسی زبان میں اوّلین ترجمہ شائع کرا دیا تاکہ عام طبقہ جو عربی زبان سے ناواقف ہے، مقامی زبان میں قرآن کی تعلیم سے آشنا ہو سکے، لیکن ہمارے مولوی اور پیر جنہوں نے "أربابا من دون اللہ" کا مقام حاصل کر لیا تھا، کی طرف سے اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ وہ ان کے درپے ہو گئے اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے باوجود آپ نے ہمت نہ ہاری اور اسلامی تعلیمات سے متعلق نہایت قیمتی ذخیرہ فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ بعد ازاں آپ کے خاندان سے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے اردو زبان میں قرآن کے تراجم پیش کئے جو آج تک بہت مقبول ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے بہت سے لوگ فیض یاب ہوئے اور قرآنی تعلیمات میں دلچسپی لینے لگے۔

انہی دنوں عرب میں شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے شرعی تعلیم کے نفاذ کے لئے بھرپور جدوجہد شروع کر رکھی تھی، کیونکہ وہاں بھی دینی تعلیم مفقود تھی اور لاتعداد آستانے وجود میں آچکے تھے جہاں مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ شیخ موصوفؒ کی اس تحریک کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور عرب کا علاقہ آہستہ آہستہ اس کے زیرنگیں آنے لگا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وہاں کے مولوی اور پیر بھی حرکت میں آئے اور غیر شرعی حکومت میں شامل ہو کر شیخ مذکور پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ آپ کی جماعت کو شیخ مذکور کے نام 'محمدؐ' کی نسبت سے محمدی کہنے کی بجائے حسد و بغض کی بنا پر وہابی کہنا شروع کیا اور یہ لفظ آہستہ آہستہ گالی اور طعن قرار پا گیا۔

بعینہٖ اس دور میں ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے سید احمدؒ بریلی کی قیادت میں انہی مقاصد کی خاطر ایک تحریک چلائی جسے قبولِ عام حاصل ہوا اور مجاہدین کی ایک جماعت تیار ہو گئی، گو اس جماعت کے قائدین سکھوں اور پٹھانوں کی ملی بھگت سے ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ میں شہید ہو چکے تھے، تاہم یہ جماعت بدستور کام کر رہی تھی اور انگریز کو اس جماعت سے سخت خطرہ لاحق تھا، لہٰذا یہاں بھی اس تحریک کو 'وہابی' کی گالی سے نوازا جانے لگا۔

مزید برآں انگریز نے اس مشکل کا حل یہ سوچا کہ مسلمانوں میں انتشار و تفرقہ پیدا کر کے انہیں آپس میں اُلجھایا اور لڑا دیا جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے انگریز بہادر کی نظر انتخاب دو آدمیوں پر پڑی۔

پہلی شخصیت مرزا غلام احمد قادیانی (متوفی ۱۳۲۶ھ) کی تھی جس نے خود نبوت کا دعویٰ کر کے اپنی الگ اُمت تیار کی۔ یہ لوگ باقی تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ انگریز کی نظر کرم اور عنایات کے باوجود اس جماعت کی خاطر خواہ مقبولیت نہ ہوسکی۔ کیونکہ ختم نبوت کا عقیدہ ایسا عقیدہ تھا جو تمام دنیا کے مسلمانوں میں بالاتفاق پایا جاتا تھا۔

دوسری شخصیت احمد رضا خان بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ) تھے جو عاشق رسولؐ بن کر سامنے آئے، انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف کے نام پر ایسے عقائد کی بنا ڈالی جو اس سے پہلے تمام امت مسلمہ میں کبھی نہ پائے گئے تھے۔ مثلاً جس طرح اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے، اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ بھی ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں یا جس طرح اللہ تعالیٰ کو مکمل طور پر غیب کا علم ہے، ایسے ہی حضورِ اکرم ﷺ کو بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور آپ کا عطائی...... ذاتی اور عطائی 'تقسیم' کے موجد بھی آپ ہی ہیں! یا یہ کہ آپؐ بشر نہیں بلکہ نور تھے، نیز یہ کہ اہل قبور پکارنے والے کی پکار کو سنتے اور اس کی حاجت روائی کی استطاعت رکھتے ہیں۔ چونکہ عشق رسولؐ کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا لہٰذا جاہل عوام میں انہیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

**نئے امام:** یہ لوگ چونکہ اہل سنت والجماعت کہلاتے اور فقہ حنفی ہونے کے دعویدار تھے اور امام ابوحنیفہؒ ایسے مشرکانہ عقائد کے سخت دشمن تھے، لہٰذا ان لوگوں نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ صرف فقہی مسائل کی حد تک امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، عقائد میں ان کے مقلد نہیں ہیں۔ یہ لوگ احمد رضا خان بریلویؒ کی نسبت سے بریلوی حنفی کہلائے اور اسی بنا پر انہیں امام اہل سنت کہا جاتا ہے......اور جو حنفی اپنے دستور سابق پر قائم رہے، وہ حنفی دیوبندی کہلائے۔

انگریز کی چال بہت کامیاب رہی، دیوبندی اور بریلوی حضرات میں بحث مباحثے، مناظرے، سر پھٹول اور تکفیر بازی شروع ہوگئی۔ بریلوی حضرات تو جماعت اہل حدیث کو جن

میں سے اکثر شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک کے کارکن تھے، وہابی کہتے ہی تھے، اب دیو بندیوں کو بھی وہابی کہنا شروع کر دیا۔ گویا ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمان تفرقہ بازی، انتشار اور آپس کی تکفیر کا نشانہ بن کر رہ گئے۔

**تکفیر بازی:** تفصیل اس اِجمال کی یہ ہے کہ آپ نے ۱۸۹۸ء میں ایک فتویٰ بعنوان 'اِعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام' شائع کیا جس میں ہندوستان کو محض اس بنا پر دارالاسلام قرار دیا گیا تھا کہ یہاں مسلمانوں کو نجی طور پر نماز، روزے اور حسبِ شرع نکاح وطلاق کی اجازت ہے۔اس فتویٰ سے انگریز کے سیاسی استحکام کو بہت تقویت پہنچی، مجاہدین نے ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر ہی تحریک شروع کی تھی لہٰذا وہ سب کافر بلکہ یہودیوں سے بھی بدتر قرار دیئے گئے۔ 'تمہیدِ ایمان' اور 'حسام الحرمین' میں تو اعلیٰ حضرت خان صاحب گالی گلوچ پر اُتر آئے چنانچہ صفحہ ۳۷ سے ۸۳ تک پورے دس صفحات پر مشتمل گالیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی، جو قابل دید ہے۔ 'دوزخ کے کتے' آپ کا تکیہ کلام ہے۔صفحہ ۱۲ پر مناظرانہ رنگ میں اُلو گدھے اور سوٗر تک مخالفین کو کہہ دیا اور کئی جگہ وہابیوں کو واجب ُالقتل قرار دیا بلکہ یہاں تک لکھا کہ ایک وہابی کو قتل کرنا سو کافر کے قتل سے افضل ہے اور بادشاہِ اسلام اس کا مجاز ہے......

صفحہ ۶۸ پر لکھا:

"یہودی کا ذبیحہ حلال ہے اگر خدا کا نام لے کر کرے مگر وہابی دیوبندی کا ذبیحہ نجس اور مردار قطعی ہے اگرچہ لاکھ بار خدا کا نام لے، یہ سب مرتد ہیں۔"

اس فتویٰ کی زد میں صرف تحریکِ مجاہدین کے وہابی ہی نہ آئے بلکہ انگریز کے خلاف تحریکِ آزادی کی جتنی بھی انجمنیں وجود میں آئیں خواہ وہ مسلم لیگ ہو یا جمعیت علماءِ ہند یا مجلس اَحرار، ان سب انجمنوں کے لیڈروں اور ممبروں پر جناب احمد رضا خان صاحب اور ان کے خاص معتقدین نے کفر کا فتویٰ لگایا اور ان سے تعاون حرام قرار دیا،حتیٰ کہ بانئ پاکستان محمد علی جناح اور علامہ اقبالؒ بھی نہ بچ سکے، بانئ پاکستان کے متعلق کہا:

"بحکم شریعت مسٹر جینا (جناح) اپنے عقائدِ کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج اَز اسلام ہے، جو شخص اسے مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر!"

(تجانب اہلسنّت، ص ۱۲۲)

علامہ اقبالؒ پر تو پورے ۱۴ صفحے سیاہ کیئے گئے، لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال نے دہریت والحاد کا زبردست پراپیگنڈہ کیا ہے۔'' (تجانب ص ۲۴۰)

علامہ موصوف پر اس قدر برہمی کا باعث غالباً آپ کا یہ شعر بنا جو آپ کے فتویٰ کے بالکل برعکس تھا

ملاں کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت    ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

ڈاکٹر اقبال پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ مولوی دیدار علی شاہ والد ماجد سید ابوالبرکات احمد، انجمن حزب الاحناف لاہور نے لگایا تھا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی، شبلی نعمانیؒ، اور الطاف حسینؒ حالی بھی حضرت خان صاحب کے فتویٰ تکفیر سے نہ بچ سکے۔ (تجانب صفحہ ۱۲۲)

حالیؒ پر کفر کے فتویٰ کا سبب، ان کے غالبًا یہ اشعار تھے......

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر    جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر    کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں    پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں    اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں!
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں    شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس میں آئے    نہ اسلام بگڑے، نہ ایمان جائے

ناظرین! مذکورہ بالا تفصیل اگرچہ ایک ایک مستقل موضوع ہے تاہم اس سے بتلانا یہ مقصود تھا کہ جناب خان صاحب نے اپنے فرقہ کے سوا باقی تمام مسلمانوں کو کافر اور گردن زدنی قرار دیا۔ سیاسی فرقوں کو اس لئے کہ وہ انگریز کے خلاف تحریک آزادی میں مشغول تھے اور مذہبی فرقوں کو اس لئے کہ ان کے عقائد آپ کے عقائد سے ٹکراتے تھے۔

**محبت کا معیار:** جب کوئی قوم اپنے نبی کی تعلیم اور اس پر عمل سے عاری ہوجاتی ہے تو وہ 'پدرم سلطان بودُ کے مصداق اپنے نبی کی شان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہی کچھ پہلی امتوں نے کیا اور یہی روش عاشقانِ رسول نے اختیار کی۔ اس فرقہ کے پیشوا امام اہل

سنت صرف عالم ہی نہ تھے شاعر بھی تھے۔ آپکے نعتیہ کلام کے مجموعہ کا نام 'حدائق بخشش' ہے۔ ان نعتوں میں آپ نے اکثر مقامات پر عبد اور معبود کے فرق کو یکسر ختم ہی کر دیا ہے۔ مثلاً:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب    یعنی محبوب و محبّ میں نہیں میرا تیرا

یعنی حضور اکرم ﷺ چونکہ مالک (خدا) کے حبیب ہیں تو بس انہیں بھی میں مالک ہی سمجھتا ہوں کیونکہ محبوب اور محبّ کی ملکیت (ملکوت السموات والارض) مشترکہ ہی ہوتی ہے۔

گویا اب حبِ رسول کا معیار یہ ٹھہرا کہ جو کوئی شخص اس پرخطر وادی میں جتنی زیادہ جولانی دکھائے، اتنا ہی زیادہ وہ محبّ اور عاشق رسولؐ ہے۔ چنانچہ آپ کے معتقدین اس میدان میں آپ سے بھی بازی لے گئے، جس کی صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

افسوس ان لوگوں نے حبِ رسولؐ کا معیار وہ قائم کیا جس سے آپ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا تھا۔ اس کے برعکس جو معیار خود آپؐ نے بتلایا ہے ذرا وہ بھی سنئے اور غور فرمایئے کہ دونوں میں کس قدر تضاد ہے:

"عن عبدالله بن مغفل، قال جاء رجل إلى النبي ﷺ فقال إني أحبك قال، «أنظر ماذا تقول؟» قال إني أحبك ثلاث مرات قال «إن كنت صادقا فأعد للفقر تجفافا الفقر أسرع إلى من يحبني عن السيل إلى» مفتلهى رواية «إن الفقر إلى من يحبني منكم أسرع من السيل من أعلى الوادي»

"حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں آپؐ سے محبت رکھتا ہوں" آپؐ نے فرمایا: "سوچ لو، جو کہہ رہے ہو؟" اس نے تین مرتبہ آپؐ سے محبت کے دعویٰ کو دہرایا۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو پھر فقر اور اس کے ساتھ آنے والی تکلیفوں کے لئے لوہے کا ایک جھولا تیار کر لو، کیونکہ مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے رکا ہوا پانی نشیب کی طرف جاتا ہے۔" اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ "تم میں سے جو مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کی طرف فقر اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے جیسے کہ وادی کی بلندی سے پانی نشیب کی طرف جاتا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ سے محبت رکھنے والے صحابہ کرامؓ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور جس حد تک کسی نے محبت کا دعویٰ کیا اسی حد تک وہ ضرور متاثر ہوا۔ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«أشد البلاء هم الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل» ''سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر نازل ہوتے ہیں، پھر ان کے ساتھیوں اور پھر ان کے ساتھیوں پر''!

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان محبانِ رسول ﷺ پر کیا مصائب نازل ہوئے جنہوں نے جہاد کو یکسر موقوف کر کے عیش و آرام کو ترجیح دی اور کھانے پینے کی کئی بدعانہ رسومات کو شریعت کا درجہ دے دیا تو کیا صرف زبانی محبت کا دم بھرنے، نبی کی شان میں غلو کرنے، جشن عید میلاد النبی ﷺ منانے اور جلوس نکالنے سے جن میں سے ہر ایک فعل شریعتِ مطہرہ کے یکسر خلاف ہے، یہ لوگ نبی کی محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اور اس سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ انہیں قرآن و سنت کی تعلیم کس طرح راس آ سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امامِ اہل سنت نے 'کنز الایمان' کے نام سے قرآن کریم کا ترجمہ کیا تو اس ترجمہ میں بریکٹوں میں ایسے الفاظ کا اضافہ کر دیا کہ عقل دنگ رہ جاتی اور انسان سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ہر مقام پر رسول اللہ ﷺ کو بشر کے بجائے نور اور عالم الغیب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ان دو باتوں کو ہی درست تسلیم کر لیا جائے تو جہاں آپ کی بعثت کا مقصد ہی سرے سے فوت ہو جاتا ہے وہاں آپ کی ذات پر ایسے ایسے اعتراضات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اگر تمام امتِ مسلمہ بھی ان اعتراضات کے جوابات سے عہدہ برآ ہونا چاہے تو کبھی نہ ہو سکے۔

بعض دفعہ ہمیں بریلوی علما کے اس تعصب پر سخت افسوس آتا ہے کہ کبھی تو اس آیت ﴿اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ کو وہابیوں والی آیت کہہ دیتے ہیں اور عموماً نماز میں ایسی آیات پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور کبھی ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا﴾ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی بس تلاوت ہی لازم ہے، اس کا ترجمہ نہیں ہے اور حقیقی مطلب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جہاں یہ صورت حال ہو تو کیا آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ یہ

لوگ قرآن کریم کے ترجمہ کی طرف توجہ دیں گے جبکہ اس طبقہ کو قرآن وسنت کی خالص تعلیم کی ضرورت ہی نہیں ہے؟...... چنانچہ قرآن نافہمی کے اسباب سے سب سے بڑا 'سبب' عاشقانِ رسول کا یہ رویہ ہے!

غیر مسلموں نے مسلمانوں کو کمزور کرنے اور انہیں اسلامی تعلیمات سے دور رکھنے کے لئے جو کچھ کیا، وہ ایک الگ داستان ہے یہاں ہم صرف ان اَسباب کا جائزہ لے رہے ہیں جن کی وجہ سے گھر کو گھر ہی کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ بہرحال یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلے میں ہمیں اَغیار کی طرف سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا اپنوں نے پہنچایا ہے۔ بقول شخصے

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

کہ ''میں بیگانوں کا رونا نہیں روتا، میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اَپنوں ہی نے کیا ہے۔''

اور یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے جس کی گواہی خدا کے حضور قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ بھی دیں گے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا﴾ (الفرقان:۳۰)

''اور رسول اللہ ﷺ فرمائیں گے کہ اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

## صحیح حل

قرآنِ کریم محض اس لئے نازل نہیں ہوا تھا کہ اسے متبرک کتاب سمجھ کر ریشمی غلاف میں محفوظ کرکے بلند طاقوں پر سجا دیا جائے یا تبرک کے طور پر کسی تقریب کا افتتاح کرلیا جائے، نہ ہی یہ اس لئے نازل ہوا کہ حروف، آیات اور کلمات کی صحیح صحیح گنتی کی جائے یا اسے اعلیٰ کاغذ پر خوشنما کرکے طبع کردیا جائے، بلکہ یہ کتاب ہماری ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھی کہ اسے سمجھا جائے اس میں تدبر کیا جائے اور اس کی ہدایات اور اَحکام پر عمل پیرا ہوکر اپنی زندگی کو سنوارا جائے اور اسلام کی سربلندی کے لئے کوشش کی جائے۔

لہٰذا ہمارے خیال میں اس کی بہترین صورت وہی ہے جس کی طرف ہم آغاز میں

اشارہ کر چکے ہیں کہ بچے کو ابتدا ہی سے قرآنی الفاظ کے معانی سے بھی روشناس کرایا جائے۔ بچے بالکل ابتدائی تعلیم مسجدوں اور گھروں میں حاصل کرتے ہیں۔ اسی بنیاد سے یہ عمارت کھڑی ہونی چاہیئے اور مدارسِ عربیہ میں تو لازماً پہلے ہی سال صرف ونحو کے ساتھ ساتھ ترجمہ قرآن بھی سرسری طور پر ختم کیا جانا چاہیئے، تاکہ اگر کوئی طالبِ علم مدرسہ کا کورس پورا نہیں کر پاتا تو کم از کم قرآن کریم کے ترجمہ سے تو روشناس ہو سکے چنانچہ اسی نظریہ کے تحت راقم الحروف نے بچوں کو ابتدا ہی سے ترجمہ پڑھانے کا تجربہ گھر سے شروع کیا جس کے نتائج نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں اور اسی بنا پر ہم یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اونچی سطح پر بھی یہ تجربہ ان شاء اللہ نہایت کامیاب ثابت ہوگا۔

حفظ کرنے والے بچوں کو اگر ترجمہ بھی پڑھا دیا جائے تو انہیں حفظ کرنے میں بھی سہولت رہتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے بچے بھی خوش ہوتے ہیں اور ان کے والدین بھی۔ بچے جب اپنے گھروں میں جا کر والدین کو اپنے سبق کا ترجمہ بھی سناتے ہیں تو وہ باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ مدرسہ میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لئے ہم نے یہ التزام کیا ہے کہ جو بچہ کلاس سے غیر حاضر ہوگا اسے پچاس پیسے یومیہ جرمانہ ہوگا۔ فیس مطلقاً نہیں ہے، بچے اوّلاً تو بہت کم غیر حاضری کرتے ہیں، اور اگر غیر حاضر ہو جائے تو جرمانہ کی رقم بخوشی ادا کر دیتے ہیں اور یہ ترجمہ سے ان کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اندریں صورت سب دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ اس بے حد اہم کام کی طرف فوری توجہ دیں اور ناظرہ قرآن کریم پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو ترجمہ سکھانے کا بھی التزام کریں۔

بازار سے جو ابتدائی قاعدے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں بعض الفاظ مہمل بھی ہوتے ہیں اور بعض الفاظ معانی کے لحاظ سے دقیق بھی۔ لہٰذا ہم ایک ایسا قاعدہ مرتب کرنا چاہتے ہیں جس میں تقریباً تمام اَلفاظ قرآنی ہوں اور بامعنی بھی ہوں۔ اس قاعدہ میں یہ التزام بھی رکھا گیا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر قاعدہ میں شائع نہ کی جائے۔ قاعدہ کی ضخامت ۲۴ چھوٹے صفحات سے زیادہ نہ ہو اور قیمت بھی چند روپوں سے بڑھنے نہ پائے۔ اگر یہ قاعدہ حسبِ خواہش زیورِ طباعت سے مزین ہو گیا تو ابتدا ہی سے عربی اَلفاظ کا ترجمہ پڑھانے کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

اس میں ہم قارئین سے اس پروگرام کی تکمیل میں کامیابی کی دعا کی درخواست کے ساتھ

ساتھ یہ اپیل بھی کریں گے کہ وہ اس اہم ترین فریضہ کی انجام دہی میں ہر ممکن تعاون کریں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہر حلقہ میں، ہر سطح پر اس پروگرام کو فروغ دیں اور قرآنی تعلیمات کی ترویج کے سلسلہ میں اپنے فرائض سے کماحقہ عہدہ برآ ہو کر عنداللہ ماجور ہوں۔

؎ گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

مولانا رضا احمد

# فہم قرآن کے آداب و شرائط

قرآنِ کریم کا فہم و تعلّم ایک مقدس عبادت ہے لہٰذا دیگر عبادات کی طرح اس عبادت کا حق بھی یہ ہے کہ آدمی اہتمام کے ساتھ اسے ادا کرے۔فہم قرآن کے لئے جن آداب و شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہیں:

- نیت کی پاکیزگی
- قرآنِ کریم کو ایک برتر کتاب تسلیم کرنا
- قرآنِ کریم کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کا عزم
- اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی عطا کرنے کی دُعا

## ❶ نیت کی پاکیزگی

قرآنِ کریم صحیفہ ہدایت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں ہدایت حاصل کرنے کی خواہش ودیعت کی ہے۔اسی خواہش کے تحت طلبِ ہدایت کی نیت سے اگر قرآن کریم سے استفادہ کیا جائے تو بقدرِ کوشش اور توفیق الٰہی انسان اس سے فیض یاب ہوگا۔جو لوگ اس کتاب کو مخصوص نظریات لے کر پڑھتے ہیں تو وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے جاتے ہیں اور قرآنی ہدایت کی انہیں ہوا تک بھی نہیں لگنے پاتی۔قرآن کریم نے اس کی اسی صفت کو یہ کہہ کر بیان فرمایا ہے:

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهِ كَثِيْرً﴾ (البقرہ:۲۶)

''اللہ اس کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔''

## ❷ قرآنِ کریم کو ایک برتر کتاب تسلیم کرنا

کسی کتاب کے بارے میں اس کو سمجھنے سے پہلے ہی یہ حسن ظن قائم کرلینا کہ وہ ایک عظیم و برتر کتاب ہے،ایک عجیب بات ہے لیکن قرآنِ کریم کے بارے میں یہ حسن ظن کوئی تعجب انگیز

نہیں ہے۔ کوئی شخص اس پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کرسکتا کہ جتنا بڑا انقلاب اس کتاب نے دنیا میں پیدا کیا، وہ کسی کتاب نے کبھی برپا نہیں کیا۔ قرآنِ کریم اپنی ایک عظیم تاریخ رکھتا ہے۔ اس تاریخ کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ ضروری ہے۔ اس کتاب کو ایک خاص دور کی کتاب ماننا، محض حلال وحرام کا ایک فقہی ضابطہ سمجھنا، یا اسے حصولِ برکت و دافع البلیات کتاب سمجھ کر پڑھنا، اس کے فیض سے اپنے آپ کو محروم کردینے والی بات ہے!!

## ❸ قرآن کریم کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کا عزم

قرآنِ کریم سے صحیح استفادہ کی ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی اپنے آپ کو اس کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کا عزم دل میں پیدا کرے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے جہاں یہ محسوس ہو کہ میری زندگی اس کی مقرر کردہ حدود سے ہٹی ہوئی ہے یا ایک مؤمن کے لئے جو معیار اس نے پیش کیا ہے، میرا معیارِ زندگی اس سے مختلف یا اس سے فروتر ہے، تو عزم یہ ہونا چاہئے کہ میں اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کروں گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قرآنِ کریم سے استفادہ کا طریقہ یہی تھا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ انہوں نے سورہ بقرہ سے استفادہ پر آٹھ سال صرف کئے یعنی اس کی رہنمائی کے مطابق اپنے عمل کو بھی ڈھالا۔

## ❹ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دُعا

قرآنِ کریم سے استفادہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی عطا کرنے کی دُعا بھی کرنی چاہئے۔ اس غرض کے لئے احادیثِ نبویؐ میں وارد دُعاؤں کا پڑھنا مفید ہے۔ مندرجہ ذیل دُعا اکثر پڑھتے رہنا چاہئے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ اِبْنُ عَبْدِكَ اِبْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِي بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُ كَ أَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذِهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ"

''اے اللہ! میں تیرا غلام، تیرے غلام کا بیٹا اور تیری لونڈی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیری مٹھی میں ہے، مجھ پر تیرا حکم جاری ہے، میرے بارے میں تیرا فیصلہ حق ہے، میں تجھ سے تیرے ہر نام کے واسطے سے جو تیرا ہے، جس سے تو نے اپنے کو پکارا یا جس کو تو نے اپنی کتاب میں اتارا ہے یا جس کو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یہ درخواست کرتا ہوں کہ قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا اور میری فکر و پریشانی کا علاج بنا دے۔''            (آمین)

اس مضمون کو مولانا عبدالغفار حسن کے مضمون کے بعد لگا دیں۔ حسن

اس بحث کو شائع نہ کیا جائے۔حسن

عجیب بات یہ ہے کہ بعض اوقات احادیث ہوتے ہوئے بھی تفسیرِ قرآن میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔مثلاً

﴿فَاقْرءُ وأما تيسّرَ مِنَ القُرءَان﴾ (　　) ترجمہ

بعض لوگوں نے اس کی تفسیر 'تلاوتِ نفسی' سے کی ہے۔ان کے مطابق تمام نمازوں میں فقط ایک آیت یا تین مختصر آیات پڑھنا ہی ضروری ہے، اس کے باوجود کہ صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے وارد ہے کہ

"لَا صَلَاة لِمَنْ لَمْ يَقرا بفَاتِحَةِ الكِتَابِ" (　　)

ترجمہ

اور دوسری حدیث میں ہے کہ

"مَنْ لَم يَقرَا بِفاتِحَهِ الكِتَابِ فَصَلَاته خِدَاجٌ فَصَلَاتُه خِدَاجٌ غَير تَمَام"

ترجمہ

یہ دونوں احادیث آیت کی تفسیر میں اس رائے کی تردید کرتی ہیں کہ اس اسے مطلق قراۃ مراد ہے۔ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سورہ فاتحہ کی قراءت ہے۔

اس موقع پر بعض متاخرین دوبارہ حدیث متواتر اور حدیث احاد کی بحث کھول لیتے ہیں اور کہتے ہیں قرآن کی تفسیر فقط خبر متواتر سے ہی کرنا صحیح ہے۔

فَاقْرَءُ وْامَا تَيَسَّرَ مِنه لیکن تمام علمائے تفسیر (جن میں متقدمین میں بھی ہیں، متاخرین بھی) نے واضح کیا ہے کہ آیت کریم میں فَاقْرَءُ وْا سے مراد یہ ہے کہ تم رات کی نماز سے جتنی نماز پڑھ سکتے ہو، پڑھو۔ کیونکہ اللہ عزوجل نے اس آیت کو سورۂ مزمل میں اس آیتِ کریمہ کے سیاق میں ذکر کیا ہے

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ أَنْ لَّن تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُ وا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ (　　)

یعنی رات کی جتنی نمازیں پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ پس آیت اس سے متعلق نہیں کہ رات کی

نماز میں خصوصاً انسان پر کچھ پڑھنا واجب ہے اور اللہ نے مسلمانوں کے لئے آسانی کی ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ سکتے ہیں پڑھ لے۔

لہٰذا امت کے لئے واجب نہیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ جتنی (یعنی ۱۱ رکعات) نماز کی رکعت پڑھیں آیت کا معنی یہ ہے اور یہ عربی اسلوب کے مطابق کُل بول کر جز مراد لینا ہے۔ جز بول کر کُل مراد لینے کی مثال یہ ہے (فَقْرَءُوا) یعنی نماز پڑھو یہ کُل ہے اور قراءۃ جز ہے۔ اور لغت عربی کا علم رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ عرب کا یہ اسلوب کہ جب کل بول کر جز مراد لیا جائے تو اس کا مقصد کل میں اس جز کی اہمیت بیان کرنا ہوتا ہے جیسا کہ اللہ کے اس دوسرے فرمان میں ہے۔

﴿أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْءَانَ الْفَجْرِ﴾

"اَقِمِ" سے مراد بھی 'قرآن الفجر' ہے لیکن یہاں جز بول کر کل مراد لیا اور یہ معروف اسلوب ہے اس لئے اس آیت کی واضح تفسیر کے بعد (کہ جس میں سلف اور خلف کا کوئی اختلاف نہیں) پہلی حدیث کو رد کرنا صحیح نہیں۔ اور اس دعویٰ کے ساتھ کہ یہ خبر آحاد ہے رد صحیح نہیں کیونکہ آیت مذکورہ کی تفسیر ان علماء کے اقوال سے واضح ہوتی ہے جو کہ لغت عربی کی باریکیاں سمجھتے تھے اور اس لئے کہ حدیث نبویؐ قرآن کے مخالف نہیں ہوسکتی بلکہ (جس طرح ہم نے ابتداء میں ذکر کیا ہے) اس کی وضاحت اور تفسیر کرتی ہے۔ پس حدیث کیسے مخالف ہوسکتی ہے اور آیت کا تو اس موضع سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ مسلمان پر فرضی یا نفلی نماز میں کیا پڑھنا واجب ہے۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو وہ اپنے موضوع میں صریح ہیں کہ نماز فاتحہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔

(لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقرَا بفَاتِحَةِ الكِتَابِ[1]) (مَنْ لَم يَقرَا بِفَاتِحَتهِ الكِتَابِ فَصَلَاته خِدَاجٌ فَصَلَاتُه خِدَاجٌ غَيْر تَمَام هِىَ نَاقِصَته[2]) جس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اور سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اور سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے پس جس نے اپنی نماز مکمل کی اس حالت میں کہ وہ نامکمل تھی تو پھر اس کی کیا نماز ہوئی وہ تو اس وقت کالعدم ہی متصور ہوگئی جس طرح کی پہلی حدیث کا ظاہر اس کی طرف مشیر ہے کہ 'فاتحہ الکتاب کے بغیر

کوئی نماز نہیں،۔

# قــــرآن کی فَــریاد

از ماہر القادری مرحوم

طاقوں میں سجایا جاتا ہوں
آنکھوں سے لگایا جاتا ہوں

تعویذ بنایا جاتا ہوں
دھو دھو کے پلایا جاتا ہوں

جز دان حریر وریشم کے
اور پھول ستارے چاندی کے

پھر عطر کی بارش ہوتی ہے
خوشبو میں بسایا جاتا ہوں

جس طرح سے طوطا مینا کو
کچھ بول سکھائے جاتے ہیں

اس طرح پڑھایا جاتا ہوں
اس طرح سکھایا جاتا ہوں

جب قول و قسم لینے کے لیے
تکرار کی نوبت آتی ہے

پھر میری ضرورت پڑتی ہے
ہاتھوں میں اٹھایا جاتا ہوں

دل سوز سے خالی رہتے ہیں
آنکھیں ہیں کہ نم ہوتی ہی نہیں

کہنے کو میں اک اک جلسے میں
پڑھ پڑھ کے سنایا جاتا ہوں

نیکی پہ بدی کا غلبہ ہے
سچائی سے بڑھ کر دھوکہ ہے

اک بار ہنسایا جاتا ہوں
سو بار رلایا جاتا ہوں

یہ مجھ سے عقیدت کے دعوے
قانون پہ راضی غیروں کے

یوں بھی مجھے رسوا کرتے ہیں
ایسے بھی ستایا جاتا ہوں

کس بزم میں مجھ کو بار نہیں
کس عرس میں میری دھوم نہیں

پھر بھی میں اکیلا رہتا ہوں
مجھ سا بھی کوئی مظلوم نہیں!

مزید مراجع

فہم قرآن کے آداب و شرائط          مولانا رضا احمد

شاہد صاحب کی تیار کردہ فہرست

مولانا حسن جامعی کا مضمون الاعتصام میں شائع شدہ

مولانا کریم بخش حدیث کے بغیر قرآن فہمی مشکل ہے!

محمد اقبال کیلانی کی کتاب فہم قرآن کے بنیادی اصول؟
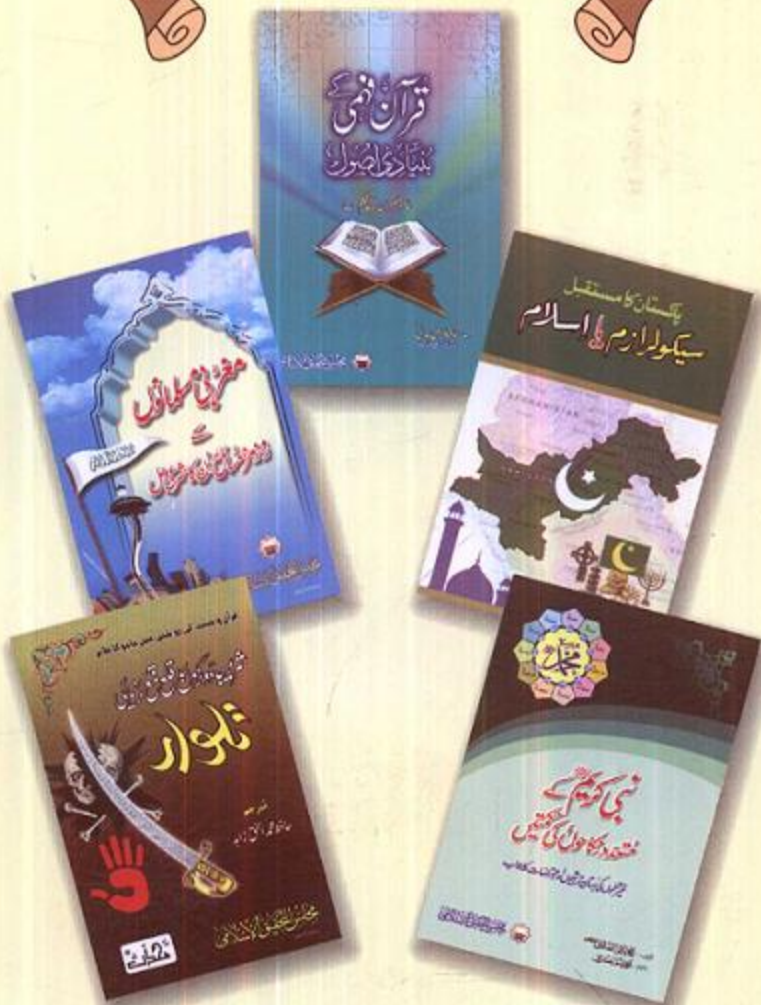
J-99 ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

فون:5866396,5866476,5839404